عرض احوال

بسم اللہ الرحمٰن الرّحیم

سلطنتِ خداداد پاکستان کو درپیش دو بحران

پاکستان اس وقت ایک آتش فشاں کے دہانے پر کھڑا ہے۔

اوّلاً تو پاکستان بھی ''ذلّت'' اور ''مسکنت'' (سورۃ البقرۃ: آیت ۶۱) کے اس عمومی عذاب سے دوچار ہے جو پوری اُمت مسلمہ پر اس لیے مسلط ہے کہ وہ اپنے فرضِ منصبی کو ادا نہیں کر رہی، یعنی نوعِ انسانی کے سامنے اسلام کے نظامِ عدل اجتماعی کا نمونہ پیش کر کے اس پر اللہ کے دین کی جانب سے حجت قائم نہیں کر رہی ——— اس ذلّت و مسکنت یعنی کمزوری اور کم ہمتی کی نمایاں ترین مثالیں فلسطین کے معاملے میں پوری اُمت کی بے بسی، اور کشمیر کے ضمن میں ہماری کم ہمتی ہیں!

ثانیاً ——— اسلامیانِ پاکستان پر اللہ تعالیٰ کا ایک اضافی عذاب اس بنا پر مسلط ہے کہ پاکستان کے مفکّر و مصور علامہ اقبال اور اس کے بانی و معمار قائداعظم نے پاکستان کا جو تصور دنیا کے سامنے پیش کیا تھا کہ یہ عہد حاضر میں اسلام کے اصولِ حریت و اخوت و مساوات کا نمونہ ہو گا ——— اور عام مسلمانوں نے اللہ سے جو گڑگڑا گڑگڑا کر دعائیں کی تھیں کہ ''اے اللہ! ہمیں انگریز اور ہندو کی دہری غلامی سے نجات دے دے تو ہم تیرے عطا کردہ ملک میں تیرے دین کا بول بالا کریں گے اور شریعتِ محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو نافذ کریں گے''، ہم نے ان تمام وعدوں کی خلاف ورزی کی ہے ——— چنانچہ سورۃ التوبہ کی آیات ۷۵ تا ۷۷ کے مطابق ہم پر اس وعدہ خلافی کی سزا نفاق کے مرض کی صورت میں مسلط کر دی گئی ہے۔ جس کا ایک مظہر تو یہ ہے کہ مسلم قومیت (Muslim Nation-hood) کا تصور ختم ہو چکا ہے اور اس کی جگہ نفاقِ باہمی نے صوبائی، علاقائی، نسلی اور لسانی ''قومیتوں'' کی صورت اختیار کر لی ہے! اور دوسرا مظہر نفاق عملی کی صورت میں مسلط ہے، یعنی اخلاق کا دیوالہ نکل گیا ہے اور نبی اکرم ﷺ کی حدیثِ مبارک کے مطابق منافقت کی چاروں علامات یعنی جھوٹ، وعدہ خلافی، خیانت اور چھوٹے چھوٹے جھگڑوں میں آپے سے باہر ہو جانا، ہمارے جسد ملّی میں نمایاں طور پر موجود ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی جانب سے متذکرہ بالا دو عمومی سزاؤں پر مستزاد ہم پر عذاب الٰہی کا ایک کوڑا ۱۹۷۱ء میں پاکستان کے دولخت ہونے اور ہماری پیشانی پر عبرتناک شکست کا داغ لگنے کی صورت میں پڑا۔ پھر سیاچین ہمارے ہاتھ سے گیا' پھر کارگل کا جُو اہم نے ہارا ——— اور اب ایک جانب کشمیر کا جو تھوڑا بہت حصہ ہمارے پاس ہے وہ بھی ہمارے ہاتھ سے جاتا نظر آ رہا ہے! اور دوسری جانب ایک خوفناک داخلی خلفشار آتش فشاں پہاڑ کے مانند پھٹنے کو ہے اور شدید خطرہ ہے کہ سورۃ السجدۃ کی آیت ۲۱ کے مطابق چھوٹے چھوٹے عذابوں کے بعد اب ''عذابِ اکبر'' نہ آ جائے' یعنی خاکم بدہن پاکستان کے خاتمے کی منزل قریب نہ آ گئی ہو! اعاذنا اللّٰہ مِنْ ذٰلک!!

پاکستان کو لاحق داخلی خلفشار کی دو اطراف (dimensions) ہیں: چنانچہ ایک جانب ۹ مارچ کو شروع ہونے والی عوامی تحریک ہے جو اب خطرناک موڑ تک آ پہنچی ہے اور اس نے پاکستانی سیاست میں مسلح افواج کے عمل دخل کے خلاف ایک عوامی احتجاج کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اور یہ اب ۱۹۷۷ء کی پی این اے کی تحریک کے مشابہ ہوتی نظر آ رہی ہے۔ اس تحریک کے نتیجے میں اگر ملک میں بدامنی کی صورت پیدا ہو گئی تو ہماری مغربی سرحد کے ساتھ نیٹو (NATO) کی افواج گھات لگائے بیٹھی ہیں کہ ایسی کسی صورت کو بہانہ بنا کر پاکستان میں براہِ راست دراندازی کریں ——— اور خصوصاً پاکستان کے ایٹمی اثاثوں کو ختم کر دیں یا اپنے کنٹرول میں لے لیں ——— اور ادھر مشرقی سرحد کے ساتھ بھارت بھی اسی تاک میں ہے اور اس نے اپنی افواج کو الرٹ بھی کر دیا ہے کہ تیار رہو' ہو سکتا ہے کہ ہمیں کسی پڑوسی ملک میں ''قیامِ امن'' کے لیے مداخلت کرنی پڑے! گویا وہ ۱۹۷۱ء کا ایکشن ری پلے کرنے کی سوچ رہا ہے!

اس صورت حال میں ایک جانب تو تنظیم اسلامی اور تحریک خلافت پاکستان کی درد مندانہ درخواست صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف سے ہے کہ اگر وہ واقعتاً ''سب سے پہلے پاکستان'' پر یقین رکھتے ہیں تو اس کے وجود اور بقا پر اپنے ذاتی اقتدار کو مقدم نہ رکھیں' بلکہ داخلی اور خارجی دونوں اطراف سے آنے والی ''صدائے خلق'' کو ''نقارۂ خدا'' سمجھتے ہوئے جلد از جلد صدارتِ پاکستان اور چیف آف آرمی اسٹاف کے دونوں عہدوں سے علیحدہ ہو جائیں اور اس سے قبل ایمرجنسی کو ختم کر کے اس کے تحت اٹھائے گئے اقدامات کو واپس لے لیں! اور اس سے پہلے کی عدلیہ کو بحال کر دیں!

اور دوسری جانب بحالیٔ جمہوریت کے لیے جو گرینڈ الائنس بننے جا رہا ہے اس کے

قائدین سے بھی ہماری درخواست ہے کہ وہ اپنی تحریک کو بالکل پرامن رکھنے کو اپنی ''ذمہ داری'' سمجھیں اور بدامنی کی کوشش کرنے والوں کو اپنا اور ملک کا دشمن سمجھتے ہوئے خود پکڑ کر انتظامیہ کے حوالے کریں ——— اور اگر خدانخواستہ حالات ان کے کنٹرول سے باہر ہوتے نظر آئیں تو پاکستان کی بقا کی خاطر اپنی تحریک کو Call off کر دیں ——— جیسے آنجہانی گاندھی نے ایک احتجاجی تحریک کے دوران مشرقی ہند کے ایک شہر چَوراچَوری میں جب عوام نے پولیس کے تشدد پر مشتعل ہو کر ایک تھانے کو اس میں موجود سپاہیوں سمیت جلا دیا تھا تو اپنی تحریک کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا تھا!

اس کے ساتھ ہی ملک میں ایک دوسرا خلفشار بھی پاکستان کے وجود کی جانب اژدہا کے مانند جبڑا کھولے بڑھتا نظر آ رہا ہے۔ اور وہ ہے ملک میں ایک جانب انتہا پسند سیکولرزم اور مادر پدر آزاد روشن خیالی کے حامی اور دوسری جانب اسلامی تہذیب اور شعائر کے علمبردار اور ملک میں نظامِ اسلامی اور شریعتِ محمدیؐ کے نفاذ کے خواہش مند لوگوں کے مابین محاذ آرائی (polarization) اور تصادم۔

اس ضمن میں یہ واضح رہنا چاہیے کہ ایک تو یہ ملک اسلام کے نام ہی پر بنا تھا' اور اسلام کے نفاذ سے قاصر رہنے کے باعث اپنا جواز (Raison d`etre) کھو رہا ہے ——— اور دوسرے افغانستان میں سوویت یونین کو شکست دینے کے لیے خود امریکہ اور اس کے حواریوں نے ''جہاد'' کی جو بھٹی دہکائی تھی وہ اب ان کی خواہشات اور مصلحتوں کے تابع نہیں رہی بلکہ ان کے کنٹرول سے باہر ہو گئی ہے' اور نہ صرف افغانستان میں نفاذ اسلام کے لیے مسلح جدوجہد جاری ہے بلکہ پاکستان کے پختون علاقے میں بھی شروع ہو چکی ہے ——— اور یہ علاقہ وہ ہے جس کے بارے میں مشہور مصری ادیب اور مؤرخ علامہ شکیب ارسلان نے کہا تھا کہ سطح مرتفع پامیر سے شروع ہونے والے دو سلسلہ ہائے کوہ' یعنی جنوب مشرق کی جانب کوہِ ہمالیہ' اور جنوب مغرب کی جانب کوہِ ہندوکش' کے مابین جو مثلث وجود میں آتی ہے اس میں وہ قوم آباد ہے جس میں اسلام کی جڑیں اتنی گہری ہیں کہ اگر باقی پوری دنیا میں اسلام کی نبضیں ڈوب جائیں تب بھی یہاں اسلام کی نبض چلتی رہے گی ——— اِس وقت نفاذِ شریعت کی جو تحریک مالاکنڈ کے شمال میں واقع علاقوں میں چل رہی ہے اسے طاقت اور تشدد کے ذریعے ختم کرنا ممکن نہیں ہوگا ——— بلکہ اس کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ پاکستان میں نفاذِ شریعت کے لیے دستوری و قانونی اور تدریجی و پرامن راستہ کھول دیا جائے ——— یعنی دستورِ پاکستان میں موجود اسلامی دفعات

جیسے دفعہ ۲۔الف یعنی قرارداد مقاصد اور دفعہ ۲۲۷ جس میں پاکستان میں اسلامی قوانین کے نفاذ کا عزم ظاہر کیا گیا ہے ——— ان کو غیر مؤثر بنانے والی دفعات ختم کر کے ایک جانب اسلامی آئیڈیالوجی کونسل کی جانب سے اب تک جو سفارشات پیش ہوئی ہیں انہیں عوام کے سامنے بھی لایا جائے اور انہیں پارلیمنٹ میں پیش کر کے قانون سازی کا آغاز کر دیا جائے اور دوسری جانب آئندہ کے لیے فیڈرل شریعت کورٹ پر عائد جملہ تحدیدات بھی ختم کر دی جائیں اور اس کے ججوں کا مرتبہ بھی کم از کم ہائی کورٹس کے ججوں کے مساوی رکھا جائے اور ان میں جملہ مسالک کے جیّد اور مسلّم علماء کو شامل کیا جائے ——— تاکہ عوام کے جذبات کو تسکین حاصل ہو اور وہ غیر قانونی اور عسکریت پسندی کا راستہ اختیار نہ کریں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اگر موجودہ بحران بخیر و خوبی حل ہو بھی جائے' اور ملک میں ایک آزاد سیاسی حکومت قائم ہو جائے' جس میں صدر پرویز مشرف کے ساتھ یا ان کے بغیر پی پی پی اور ایم کیو ایم کو کوئی فیصلہ کن حیثیت حاصل ہو جائے اور وہ اپنے اعلان شدہ عزائم کے مطابق اس ملک میں ریاستی جبر کے ذریعے ننگے سیکولرزم کے نفاذ اور مغرب سے درآمد شدہ روشن خیالی رائج کرنے کی کوشش کریں اور بالخصوص دینی مدارس کے خلاف کوئی اقدام کریں' جیسے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو صاحبہ نے کہا ہے' تب ملک جلد ہی دوسرے بحران سے دوچار ہو جائے گا۔ اس ضمن میں اس حقیقت کی جانب توجہ مبذول کرانا ضروری ہے کہ اسلام آباد کی لال مسجد کے اندوہناک واقعے نے دینی مدارس کے طلبہ میں ایک ہیجانی کیفیت کی لہر دوڑا دی ہے اور وہ نفاذِ اسلام کے لیے جانیں قربان کرنے کے لیے بے تاب ہیں۔ چنانچہ ان کے ایک بڑے اجتماع میں' جو حال ہی میں مسجد مہابت خان پشاور میں منعقد ہوا تھا' نفاذِ شریعت کے لیے منظّم جدوجہد کرنے کے لیے ایک اہم عالم دین مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ کے ہاتھ پر بیعت بھی کر لی گئی ہے ——— اگرچہ تاحال یہ امر موجب اطمینان ہے کہ مولانا موصوف نے اعلان کیا ہے کہ ''ہم نفاذِ اسلام کے لیے نہ انتخابات کا راستہ اختیار کریں گے نہ مسلح جدوجہد کا! بلکہ ایک پرامن عوامی تحریک چلائیں گے'' ——— تاہم یہ واضح رہے کہ پاکستان میں دینی مدارس کی تعداد بہت بڑی ہے (کہا جاتا ہے کہ صرف وفاق المدارس سے منسلک یعنی دیوبندی مسلک کے مدارس میں اٹھارہ ہزار مردوں کے' اور چھ ہزار طالبات کے ہیں!) اور اگر خدانخواستہ بارود کے اس ذخیرے میں کبھی کوئی چنگاری گر پڑی تو پھر جو آگ بھڑکے گی اسے بجھانا کسی کے بس میں نہیں ہوگا اور وہی خوفناک سیناریو پھر سامنے آ جائے گا جس کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے۔ اس خوفناک

(باقی صفحہ 55 پر)

بقیہ: عرضِ احوال

صورت حال کے سدّ باب کا واحد راستہ یہی ہے کہ اس ملک کے قیام کی وجہ جواز ـــــ اور اس کے عوام کی اکثریت کے دلوں کی خواہش یعنی نفاذِ اسلام کے لیے حکومت بھی دستوری اور قانونی راستے کھول دے ـــــ اور عوام اور دینی عناصر بھی کسی عسکری تحریک کے بجائے ایک پرامن، منظّم عوامی جدوجہد کا راستہ اختیار کریں ـــــ چنانچہ اسی کی دعوت تنظیم اسلامی اور تحریک خلافت پاکستان ہمیشہ سے پاکستان کے حکمرانوں، جملہ دینی جماعتوں اور عوام کو دیتی آ رہی ہے ـــــ اللہ سے دعا ہے کہ وہ پاکستان کی حفاظت فرمائے ـــــ اور اسے علامہ اقبال کے خواب، اور قائداعظم کے اعلانات کی صحیح تعبیر بنا کر ایک عالمی اسلامی انقلاب کا پیش خیمہ بنا دے ـــــ آمین!

تذکرہ و تبصرہ

قرآن کے نام پر اُٹھنے والی تحریکات
اور
اُن کے بارے میں علماءِ کرام کے خدشات

ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ

بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ تعالیٰ نے یہ خطاب رمضان المبارک ۱۴۰۴ھ کے جمعۃ الوداع کے موقع پر مسجد دارالسلام باغ جناح لاہور میں فرمایا تھا۔ شیخ جمیل الرحمٰن صاحب مرحوم نے اسے ٹیپ سے اتار کر مرتب فرمایا اور یہ میثاق ستمبر ۱۹۸۴ء میں شائع کیا گیا۔ بعد ازاں محترم ڈاکٹر صاحب کی تالیف ''جماعت شیخ الہندؒ اور تنظیم اسلامی'' کا جزو بنا دیا گیا۔ موضوع کی اہمیت کے پیش نظر یہ فکر انگیز خطاب مزید نوک پلک درست کر کے تئیس سال بعد میثاق میں دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

خطبۂ مسنونہ کے بعد تلاوتِ آیات:

اعوذ باللّٰہ من الشَّیطٰن الرَّجیم۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَتۡكُمۡ مَّوۡعِظَةٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوۡرِ وَهُدًی وَّرَحۡمَةٌ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۵۷﴾﴾ (یونس)

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسۡتَحۡیٖۤ اَنۡ یَّضۡرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوۡضَةً فَمَا فَوۡقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا فَیَعۡلَمُوۡنَ اَنَّهُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّهِمۡ ۚ وَاَمَّا الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا فَیَقُوۡلُوۡنَ مَاذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ یُضِلُّ بِهٖ كَثِیۡرًا ؕ وَیَهۡدِیۡ بِهٖ كَثِیۡرًا ؕ وَمَا یُضِلُّ بِهٖۤ

اِلَّا الۡفٰسِقِیۡنَ ﴿۲۶﴾ (البقرۃ)

﴿وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰہِ جَمِیۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا ......﴾(آل عمران:۱۰۳)

گزشتہ خطابات کا خلاصہ

پچھلے دو جمعوں سے میری گفتگو جس موضوع پر چل رہی ہے اس کا جامع عنوان ہے: ''جہاد بالقرآن''[۱] ــــــ اس ضمن میں پہلے جمعہ میں تمہیدی طور پر اُن نکات کو ایک نئی ترتیب سے پیش کیا گیا تھا جو بارہا میں آپ کے سامنے رکھ چکا ہوں۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا آلۂ انقلاب قرآن حکیم ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی جدوجہد کو اگر دو مرحلوں میں تقسیم کریں تو ایک مکی دَور ہے اور دوسرا مدنی دَور ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مدنی دَور میں نمایاں ترین چیز تلوار ہے جبکہ مکی دَور کی نمایاں ترین چیز قرآن مجید ہے۔ قرآن وہ معنوی تلوار ہے جس نے نظریاتی اور اعتقادی سطح پر شرک' کفر' الحاد اور زندقہ کا قلع قمع کیا۔ مدنی دَور کی تلوار حقیقی تلوار ہے' جس نے مشرکین و کفار کے ساتھ نبرد آزمائی کی۔ اصل میں یہ دو تلواریں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کے سپرد فرمائی تھیں' بفحوائے آیتِ سورۃ الحدید: ﴿لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَیِّنٰتِ وَاَنۡزَلۡنَا مَعَھُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡمِیۡزَانَ لِیَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ ۚ وَاَنۡزَلۡنَا الۡحَدِیۡدَ فِیۡہِ بَاۡسٌ شَدِیۡدٌ......﴾(آیت ۲۵) ''ہم نے بھیجا ہے اپنے رسولوں کو واضح نشانیوں کے ساتھ اور ہم نے اتاری ان کے ساتھ کتاب اور میزان تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں' اور اتارا ہم نے لوہا جس میں سخت لڑائی (کی صلاحیت) ہے''۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے تحت الشعور میں ایک بندۂ مؤمن کی شخصیت کا جو ہیولیٰ ہے اس کے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تلوار نظر آتی ہے۔ یہ تصور ہمیشہ سے ہمارے اجتماعی شعور میں موجود ہے۔

اسی طرح جب میں نے نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مطہرہ' آپ ؐ کی بائیس تیئیس سالہ جدوجہد اور آپ ؐ کے انقلابی عمل پر غور کیا تو یہی دو اہم مراحل میرے سامنے آئے۔

آنحضورﷺ نے آغازِ وحی کے بعد تن تنہا توحید کے انقلابی نظریہ کی تبلیغ و دعوت کا آغاز فرمایا۔ اس کا اصلی آلہ قرآن مجید تھا۔ آپؐ کی تمام مساعی کا محور و مدار قرآن مجید ہی تھا۔ جو سعید روحیں آپؐ پر ایمان لائیں آپؐ نے ان کی تربیت و تزکیہ فرمایا' ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دی' انہیں منظم فرمایا اور اس طرح متقی افراد کی ایک جماعت تیار فرمائی۔ ان اصحاب کے قلوب میں ایمان و یقین اس طور سے پیوست اور نقش ہو گیا تھا کہ جس کی بدولت ان کے اندر دین توحید کے لیے تن من دھن قربان کرنے کا جذبہ' اس راہ میں پیش آنے والے مصائب و شدائد کو برداشت کرنے کا عزم و حوصلہ' راہِ حق میں جامِ شہادت نوش کرنے کا ذوق و شوق' یہاں تک کہ اگر اللہ کے دین کے لیے گھر بار' بیوی بچے' اعزہ و اقارب کو چھوڑنا پڑے تو اس کے لیے بھی ہمہ تن آمادگی پیدا ہو گئی تھی۔ الغرض ایثار و قربانی کے وہ عزائم جو کسی بھی انقلابی تحریک کے لیے ناگزیر ہوتے ہیں' ان میں اپنے نقطۂ عروج و کمال کو پہنچے ہوئے تھے—— اس جماعت کے ہر فرد کے لیے اپنے ہادی و رہنماﷺ کا اشارہ بھی حکم کے درجہ میں تھا کہ جو بات آپؐ نے فرما دی اس پر سرِ تسلیم خم ہے۔ نورٌ علیٰ نور یہ کہ ایسا رویہ اور طرزِ عمل صرف رضائے الٰہی کی خاطر پیشِ نظر تھا۔ جدید اصطلاح میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایسے فدائین اور جاں نثاروں کی جماعت تھی جو مکمل طور پر committed افراد پر مشتمل تھی۔ اس میں سمع و طاعت کا نظام بکمال و تمام موجود تھا۔ اس جماعت کے ہر فرد کا تزکیۂ نفس اس کمال تک ہو گیا تھا کہ نفسِ انسانی کے رذیل تقاضوں' شہوات و لذات کے ناشائستہ داعیات' دل کے امراض اور اخلاقی ذمائم پر قابو پا کر انہوں نے اپنے قلوب و نفوس کو پاک کر لیا تھا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جماعت کے اوصاف کے لیے یہ بات ہی کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر ان کی مدح فرمائی ہے۔

اس سے اگلا مرحلہ یہ ہے کہ اس جماعت نے جدوجہد کی' قربانیاں دیں' کفر کی طاقت سے پنجہ آزمائی کی' مقاتلہ کیا' فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ کے مصداق انہوں نے کفار کو قتل بھی کیا اور خود بھی اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر دیا۔ اس اجتماعی جدوجہد کے

ذریعے نبی اکرم ﷺ کی قیادت میں جزیرہ نمائے عرب میں انقلاب برپا ہوگیا۔لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ ایسی جماعت کیسے وجود میں آئی! درحقیقت یہ سب جہاد بالقرآن کے باعث ممکن ہوا۔قرآن کے ذریعہ دعوت' قرآن کے ذریعہ تذکیر' قرآن کے ذریعہ انذار وتبشیر' قرآن کے ذریعہ تزکیۂ نفس' قرآن کے ساتھ راتوں کا قیام' ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَمِنَ الَّـيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ﴾ (الاسراء:۷۹) ''رات کا ایک حصہ جاگ کر گزارو اس قرآن کے ساتھ''۔﴿شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ﴾ یہ قرآن ہے' اللہ کی طرف سے نازل کردہ وعظ ونصیحت بھی یہ قرآن ہے اور اہل ایمان کے لیے شفاء اور رحمت بھی یہی ہے۔ چنانچہ اس جماعت کی تیاری میں مرکز ومحور قرآن رہا ہے۔ قرآن کو اس کا ذریعہ کہہ لیں' اس کا ہتھیار کہہ لیں' اس کا آلہ کہہ لیں' اس کا نسخہ کہہ لیں' یہ سب باتیں قرآن پر راست آئیں گی۔مولانا حالی نے کیا خوب کہا ہے:؎

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

یا بقول علامہ اقبال: ؎

در شبستانِ حرا خلوت گزید قوم وآئین و حکومت آفرید

جہاد بالقرآن کے پانچ محاذ

دوسرے جمعہ کی تقریر میں وہ پانچ محاذ گنوائے گئے تھے جن پر اِس وقت دینی اعتبار سے جدوجہد اور کشمکش کی ضرورت ہے۔ان پانچوں محاذوں کے لیے اصل ہتھیار' اصل تلوار قرآن ہے۔ان محاذوں پر جہاد بالقرآن ہوگا۔

پہلا محاذ جاہلیت قدیمہ کا ہے' جس میں مشرکانہ اوہام' بدعات اور شفاعتِ باطلہ جیسے تصورات ہیں۔ان کا توڑ صرف قرآن سے ہوگا۔اور اس کے لیے محض دورۂ ترجمۂ قرآن بہت کافی ہے۔

دوسرا محاذ جاہلیتِ جدیدہ کا محاذ ہے۔یعنی الحاد اور مادہ پرستی ہے' ہر اُس چیز کا انکار ہے جو انسان کے حواس کی گرفت میں نہ آ سکے اور جو قابل تصدیق

(verifiable) نہ ہو۔ اس کے لیے بھی تلوار قرآن ہے' لیکن یہ ذرا محنت طلب معاملہ ہے اور اس کے لیے قرآن کی حکمت اور اس کے فلسفے کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کر کے علم و حکمت کے موتی نکالنے ہوں گے۔ معرفت الٰہی کے جو حقائق فطرتِ انسانی میں جبلی طور پر مضمر ہیں ان کو قرآنی استدلال کے ذریعے شعور کی سطح پر لانے کی کوشش کرنی ہوگی اور دورِ جدید کی اصطلاحات کے ذریعے قرآنی طرزِ استدلال کا ابلاغ کرنا ہوگا۔ یہ کام اگر نہیں کریں گے تو جاہلیت جدیدہ کا مقابلہ نہایت مشکل ہوگا۔

تیسرا محاذ بے یقینی اور تذبذب کی کیفیت ہے اور اس کا علاج ہے صحبتِ اصحاب یقین ع صحبت صالح تُرا صالح کند! یہ سب سے زیادہ آسان اور سہل ذریعے ہے' لیکن یہ اصحابِ یقین بھی قرآن ہی کے ذریعے پیدا ہوں گے۔ ایسے لوگ جب قرآن میں غوطہ زنی کرتے ہیں تو وہ محسوس کرتے ہیں کہ قرآن جو کچھ کہہ رہا ہے' جو تعلیمات پیش کر رہا ہے' جو استدلال کر رہا ہے وہ ان کی بدیہیاتِ فطرت کے مطابق ہے۔ یہ حقائق ان کے باطن میں مضمر ہیں' قرآن ان کو واشگاف اور منکشف کر کے تحت الشعور سے شعور کی سطح پر لا رہا ہے۔ اس طرح قرآن ان کا باطنی تجربہ بن جاتا ہے۔ جیسے آپ کو معلوم ہے کہ چینی میٹھی ہوتی ہے' یہ علم الیقین ہے۔ لیکن جب آپ نے اسے چکھا تو آپ کے اس تجربے نے بھی بتا دیا کہ چینی واقعی میٹھی ہے۔ تجربہ سے جو یقین حاصل ہوتا ہے وہ حق الیقین ہے۔ قرآن حکیم پر حق الیقین انسان کو اُس وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ قرآن حکیم پر غور و فکر اور تدبر میں منہمک ہوتا ہے۔ وہ جب اس کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کرتا ہے تو اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ قرآن جو کچھ کہہ رہا ہے وہ میرے دل کی آواز ہے' میری فطرت اس سے مطابقت رکھتی ہے' اور میرا قلب و ذہن اسے قبول کر رہا ہے۔ اس احساس سے درحقیقت وہ یقین پیدا ہوتا ہے جسے حق الیقین کہا جائے گا۔ اسی کو علامہ اقبال نے اپنے لیکچرز میں internal experience کہا ہے۔

چوتھا محاذ ہماری نفس پرستیاں اور شیطان کی وسوسہ اندازیاں ہیں۔ ہمارے نفس کے متعلق قرآن مجید ہمیں متنبہ کرتا ہے: ﴿اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ﴾

(یوسف:۵۳) اور:﴿بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ۝﴾(القیامۃ) ہمارا نفس لذت کوشیوں اور حرام خوریوں کا عادی ہو چکا ہوتا ہے۔ہمیں غلط کاموں کی عادتیں پڑ گئی ہیں۔تو ان تمام برائیوں کے لیے تلوار قرآن مجید ہی ہے۔بقول اقبال: ؎

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است　　زانکہ او گم اندر اعماقِ دل است
خوشتر آں باشد مسلمانش کنی　　کشتۂ شمشیرِ قرآنش کنی!

ہمارے سامنے پانچواں محاذ فرقہ واریت کا ہے۔اس فرقہ واریت کی شدت کو کم کرنے اور غیریت کو ختم کرنے کے لیے ہمیں کوئی ایسی جڑ بنیاد اور کوئی ایسا مرکز ومحور درکار ہے جو ذہنی ہم آہنگی پیدا کرے اور پھر یہی ذہنی ہم آہنگی لوگوں کے اندر آپس میں قرب اور وابستگی کا ذریعہ بنے۔فرقہ واریت کے عفریت کا قلع قمع کرنے کے لیے ہمارے پاس واحد تلوار قرآن مجید ہے اور یہی ہماری ذہنی ہم آہنگی اور باہمی قرب اور وابستگی کا واحد ذریعہ ہے۔یہی سبق ہمیں سورۂ آل عمران کی آیت ۱۰۳ کے ابتدائی الفاظ میں ملتا ہے:﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا .....﴾ ''اور اللہ کی رسّی کو سب مل جل کر مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ میں مت پڑو''۔متعدد احادیثِ نبویؐ میں اس امر کی وضاحت موجود ہے کہ حبل اللہ سے مراد قرآن مجید ہے۔معلوم ہوا کہ ان پانچوں محاذوں پر ہمیں قرآن کے ساتھ جہاد کرنا ہے۔

قرآن کی بنیاد پر اسلامی انقلابی تحریک کی ضرورت

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا وہ پچھلے دو جمعوں کی تقاریر کا خلاصہ بھی ہے اور آج کی گفتگو کے لیے بمنزلۂ تمہید بھی۔ایک عرصے سے میرے ذہن میں ایک بڑا سوال بلکہ اشکال رہا ہے۔میں نے جس قدر قرآن کو پڑھا اور اپنی استعداد کے مطابق اس پر غور وفکر کیا' پھر سیرتِ مطہرہ کا معروضی مطالعہ کیا' رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ جن جن مراحل اور اَدوار سے گزری ہے ان پر آپ ﷺ کے منہج عمل اور انقلابی لائحہ عمل کو سمجھنے کے لیے سوچ بچار کیا تو اس نتیجہ تک پہنچا کہ قرآن مجید کو مرکز ومحور بنا کر ایک دعوت کا

آغاز کیا جائے اور ایک خالص اسلامی انقلابی تحریک بپا کرنے کی سعی و جہد کی جائے۔ مجھے کچھ بزرگ ہستیوں کے افکار میں اس کی بھرپور تائید بھی ملی۔ میرے نزدیک چودھویں صدی ہجری میں دو عظیم ترین شخصیتیں گزری ہیں' نہ صرف برعظیم پاک و ہند کی حد تک بلکہ میرے اندازے کے مطابق پورے عالمِ اسلامی کی حد تک۔ ان میں سے ایک علامہ اقبال ہیں جو سکولوں' کالجوں اور یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ لوگوں میں سے تھے اور انہوں نے قدیم و جدید مکاتیبِ فکر کا معروضی مطالعہ کیا۔ چنانچہ انہوں نے کہا ہے: ؎

عذابِ دانش حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل

اور دوسری شخصیت حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ ہیں' جو دارالعلوموں کی فضا سے نکلے تھے اور علمائے حقانی کے صحبت یافتہ اور فیض یافتہ تھے۔ یہ ہیں میرے نزدیک دو عظیم ترین شخصیتیں۔ ان میں سے حضرت شیخ الہندؒ کو میں چودھویں صدی کا مجدد مانتا ہوں۔ قرآن کی بنیاد پر اسلامی انقلابی تحریک برپا کرنے کی کوشش میں مجھے ان دونوں کی طرف سے تائید ملی۔ علامہ اقبال کے اشعار میں مسلمانوں کو رجوع الی القرآن کا بھرپور سبق دیا گیا ہے۔ مثلاً: ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

معلوم ہوا کہ ہمارے سامنے تجدید و احیائے دین کا راستہ ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم قرآن حکیم کی طرف رجوع کریں۔ چنانچہ علامہ نے کتنے پُرتأثیر اسلوب سے کہا ہے: ؎

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی
اے چوں شبنم بر زمیں افتندۂ در بغل داری کتابِ زندۂ

اُمت مسلمہ کے زوال کا سبب قرآن سے دوری و مہجوری ہے اور اس کا علاج یہی ہے کہ مسلمان اس کتابِ زندہ پر عمل پیرا ہو جو وہ بغل میں دبائے بیٹھا ہے یا اسے پیٹھ

پیچھے ڈال رکھا ہے۔[۲] یہی عصائے موسیٰؑ ہے جو ہمارے پاس ہے' بلکہ میں بلا ارادۂ تنقیص عرض کر رہا ہوں کہ عصائے موسویؑ کی تو قرآن کے مقابلے میں کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ اس لیے کہ عصائے موسیٰؑ کی معجز نمائی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہی رخصت ہوئی' جب کہ نبی اکرم ﷺ کا لایا ہوا معجزہ قرآن مجید آج بھی زندہ ہے اور تا قیامِ قیامت زندہ و پائندہ رہے گا۔ اس کا یہ چیلنج جو چودہ صدی قبل دیا گیا تھا' قیامِ قیامت تک باقی رہے گا: ﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ.....﴾ (البقرۃ:۲۳) ''اور اگر تم اس چیز کے بارے میں کسی شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے تو اس کے مانند ایک سورت ہی لے آؤ.....''۔

علامہ اقبال کی ولولہ انگیز ملی شاعری سے تو میں زمانۂ طالب علمی ہی سے روشناس ہو گیا تھا۔ لیکن حضرت شیخ الہندؒ کے متعلق مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد جب وہ ۱۹۲۰ء میں اسارتِ مالٹا سے رہائی پا کر وطن واپس آئے تو رجوع الی القرآن کی دعوت کو اپنا مقصدِ حیات بنانے کے عزم کا اظہار فرمایا۔ انگریزوں نے حضرت کو اُس وقت چھوڑا تھا جب وہ ٹی بی کی تھرڈ اسٹیج کو پہنچ چکے تھے' ورنہ وہ اس مردِ حق پرست کو کب چھوڑنے والا تھا! حضرت شیخ الہند نے دارالعلوم دیوبند میں ایک عظیم بات ارشاد فرمائی' جسے مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''وحدتِ اُمت'' میں یوں نقل فرمایا ہے:

> ''مالٹا کی قید سے واپس آنے کے بعد ایک رات بعد عشاء دارالعلوم میں تشریف فرما تھے۔ علماء کا بڑا مجمع سامنے تھا' اُس وقت فرمایا کہ ''ہم نے تو مالٹا کی زندگی میں دو سبق سیکھے ہیں''۔ یہ الفاظ سن کر سارا مجمع ہمہ تن گوش ہو گیا کہ اس استاذ العلماء درویش نے اسّی سال علماء کو درس دینے کے بعد آخر میں جو سبق سیکھے ہیں وہ کیا ہیں؟ (حضرت شیخ الہندؒ نے) فرمایا:
>
> ''میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دُنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم

ہوئے۔ایک ان کا قرآن کو چھوڑ دینا' دوسرے ان کے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی۔اس لیے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کروں کہ قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے۔بچوں کے لیے لفظی تعلیم کے مکاتب ہر بستی بستی میں قائم کیے جائیں' بڑوں کو عوامی درسِ قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لیے آمادہ کیا جائے اور مسلمانوں کے باہمی جنگ وجدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے''۔

میں حیران ہوتا ہوں کہ حضرت شیخ الہندؒ نے ۱۹۲۰ء میں یہ لفظ ''عوامی'' استعمال فرمایا جبکہ عوام وخواص میں سے کسی کی زبان پر یہ لفظ نہیں آیا تھا' جیسا کہ ''عوامی'' کا لفظ ہمارے دور میں عام ہوگیا ہے۔یہ بھی ان کی دور بینی اور دور اندیشی کی دلیل ہے۔نابغہ (Genius) اسی شخص کو کہتے ہیں جو بہت بعد کے حالات کو دیکھ رہا ہو۔

مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی اس بات پر بڑا خوبصورت اور بڑا موزوں تبصرہ کیا ہے۔وہ فرماتے ہیں:

''آج بھی مسلمان جن بلاؤں میں مبتلا اور جن حوادث وآفات سے دوچار ہیں' اگر بصیرت سے کام لیا جائے تو ان کے سب سے بڑے سبب یہی دو ثابت ہوں گے' قرآن کو چھوڑنا اور آپس میں لڑنا۔غور کیا جائے تو یہ آپس کی لڑائی بھی قرآن کو چھوڑنے ہی کا لازمی نتیجہ ہے۔قرآن پر کسی درجے میں بھی عمل ہوتا تو خانہ جنگی یہاں تک نہ پہنچتی''۔

حضرت شیخ الہندؒ اور مفتی محمد شفیعؒ کے خیالات وآراء سے مجھے واقعتاً بڑی تقویت ملی کہ میں نے اپنے غور وفکر اور سوچ بچار کے نتیجے میں دعوت رجوع الی القرآن کا جو کام شروع کر رکھا ہے اس کی تائید اِن دو حضرات کی آراء سے حاصل ہوگئی۔ فللّٰہ الحمد والمنّۃ۔

علماء کرام کے خدشات اور ان کا اصل سبب

ایک طرف تو صورتِ حال یہ تھی' دوسری طرف مجھے شروع ہی سے ایک دوسرے تجربے سے مسلسل سابقہ پیش آتا رہا۔میں نے اس کام کا آغاز اسی شہر لاہور سے کیا تھا

اور میں بحمداللہ اسی کام میں مسلسل لگا ہوا ہوں اور اپنی زندگی اسی کام کے لیے وقف کر رکھی ہے۔ تجربہ یہ ہوا کہ جیسے جیسے یہ کام اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت سے آگے بڑھنا شروع ہوا تو چند علماء کی طرف سے کچھ مخالفت بھی شروع ہوگئی۔ ان کی جانب سے کچھ اندیشوں، کچھ خطروں کا اظہار ہونے لگا کہ یہ دعوت ہے کیا؟ کہیں قرآن کا نام لے کر کوئی نیا فتنہ تو نہیں اٹھ رہا؟ میں حیران ہوتا تھا کہ اس کا سبب کیا ہے؟ پھر یہ کہ مخالفت صرف ایسے علماء کی طرف سے نہیں تھی کہ جن کے بارے میں لوگوں کی رائے اچھی نہ ہو، بلکہ وہ ثقہ علماء بھی جن کا میرے اپنے دل میں بڑا احترام ہے اور جن کے ساتھ میرا حسنِ عقیدت کا معاملہ ہے، تشویش میں مبتلا نظر آئے۔ میں نے محسوس کیا کہ سب کے سب اس سے الرجک (allergic) ہیں اور قرآن کے نام کی دعوت سے بہت گھبراتے ہیں۔ انہیں کچھ اندیشہ ہوتا ہے کہ قرآن کے نام پر اٹھنے والی دعوت کے پس پردہ کہیں انکارِ سنت اور انکارِ حدیث کا معاملہ نہ ہو۔ چنانچہ اس طرح کا کچھ تجربہ مسلسل ہوا۔

یہ بات میرے لیے ایک پریشانی کا موجب تو رہی لیکن میں بحمداللہ کام میں لگا رہا۔ اس لیے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے مزاج کچھ ایسا دیا ہے، اور بچپن ہی سے میرا طرزِ عمل یہ رہا ہے کہ جو بات حق معلوم ہو اُس پر ڈٹے رہو۔ میری عمر چوبیس برس کی تھی جب میں نے جماعت اسلامی کے سالانہ اجتماع منعقدہ ماچھی گوٹھ میں کھڑے ہو کر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم سے جماعت کے انقلابی طریقہ کار کو چھوڑ کر انتخابی طریق کار اختیار کرنے کی پالیسی سے ڈٹ کر اختلاف کیا تھا۔ مولانا مرحوم میرے والد کی عمر کے تھے، پھر میرے محسن بھی تھے کہ ان کی تصانیف کے مطالعہ سے مجھے دین کا صحیح مفہوم اور ایک مسلمان کی دینی ذمہ داریوں کا شعور حاصل ہوا تھا، جس پر محکم یقین مطالعۂ قرآن سے حاصل ہوا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے مزاج ایسا دیا ہے کہ جو بات سمجھ میں آتی ہے کہ درست ہے اس کا برملا اظہار کیا جائے۔ لہٰذا مولانا مودودی مرحوم کی انتخابی سیاست کے موقف پر میں نے جماعت اسلامی کا رکن رہتے ہوئے اپنا اختلافی موقف دلائل کے ساتھ تحریری شکل میں بھی پیش کیا اور ماچھی گوٹھ میں اسٹیج پر کھڑے ہو کر

بھی[۳]۔ اگر کوئی دلیل سے میری رائے اور میرے موقف کو غلط ثابت کر دے تب تو میں فوراً ہتھیار ڈالنے پر آمادہ ہوتا ہوں اور اپنی غلطی تسلیم کرنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتا' لیکن اگر کوئی اسے دلیل سے غلط ثابت نہیں کرتا تو مجھے اس کی قطعی پرواہ نہیں ہوتی کہ میری بات کی کون مخالفت کر رہا ہے۔ اللہ کا فضل ہے کہ اس نے مجھے یہ مزاج دیا ہے۔

اس اعتبار سے میرا جو مزاج ہے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں مسلسل یہ سوچتا تو ضرور رہا کہ آخر علماء کرام کو یہ الرجی کیوں ہے' وہ کیوں بدظن ہیں؟ قرآن کی طرف دعوت پر کیوں ان کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں اور وہ اندیشے اور خدشات محسوس کرنے لگتے ہیں؟ لیکن چونکہ کوئی ٹھوس بات سامنے نہیں آئی تو میں اپنی دھن میں لگا رہا اور میں نے اپنے کام میں قطعاً کوئی ڈھیل نہیں آنے دی۔ لیکن کچھ عرصہ پہلے مجھے اس معمے کا حل مل گیا اور علماءِ کرام کے طرزِ عمل اور رویہ کا سبب میری سمجھ میں آ گیا۔ ہمارے علماء کی طرف سے' بالخصوص ان کی طرف سے جن کا ہمارے قدیم دینی حلقوں سے تعلق ہے' جن اندیشوں اور خدشات کا اظہار ہوتا ہے' اصل میں اس کا سبب ان کا ایک طویل تجربہ ہے۔ وہ تجربہ یہ ہے کہ ماضی بعید و قریب میں مسلمانوں میں جتنی بھی گمراہ تحریکیں اٹھیں وہ سب قرآن کا نام لے کر اٹھیں۔ مثلاً چکڑالویت اٹھی قرآن کے نام پر۔ اسی طرح پرویزیت اٹھی قرآن کے نام پر۔ اور تو اور قادیانیت بھی قرآن کے نام پر ہی اٹھی تھی۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنے کام کی ابتداء قرآن کی عظمت کے بیان سے کی تھی۔ ان گمراہ تحریکوں کی تکنیک اور طریق کار (methodology) مَیں آگے چل کر قدرے تفصیل سے ذکر کروں گا۔

ان سب سے پہلے سرسید احمد خان نے قرآن کے نام پر بہت سی گمراہیوں کا آغاز کیا۔ تو معلوم ہوا کہ جسدِ ملّی پر پے بہ پے اتنے چرکے لگے ہیں اور علماء کو اُن تحریکات سے ایسے غلط تجربات ہوئے ہیں کہ وہ اس معاملے میں بہت حساس ہو گئے ہیں۔ جیسے ہمارے یہاں کہاوت ہے کہ ''دودھ کا جلا چھاچھ کو بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے''۔ یا

ایک دوسری کہاوت ہے کہ ''سانپ کا ڈسا ہوا رسّی سے بھی ڈرتا ہے''۔ چنانچہ ہمارے دینی حلقوں کو قرآن کے نام پر اٹھنے والی کسی بھی دعوت اور تحریک کے بارے میں فوراً ایک خطرہ' ایک اندیشہ اور ایک سوءِ ظن لاحق ہو جاتا ہے اور ان کی جانب سے خدشات کا برملا اظہار ہونے لگتا ہے جو مخالفت کا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔

علمائے کرام کے بارے میں مَیں یہ بات صاف صاف عرض کرتا ہوں کہ ان حضرات کا احترام ملحوظ رکھنے اور ان سے حسنِ عقیدت رکھنے کے باوصف میں ان کے بارے میں کسی غلو اور افراط و تفریط میں مبتلا نہیں ہوں۔ ہمارے یہاں جو علماء پائے جاتے ہیں ان میں علمائے حق بھی ہیں اور علمائے سوء بھی۔ علمائے سوء سے کوئی زمانہ کبھی خالی نہیں رہا۔ علمائے سوء اُس زمانے میں بھی سرکار دربار سے بھی متعلق رہے اور عوام الناس سے بھی جو زمانہ کئی اعتبارات سے ہمارے دور سے کہیں بہتر تھا۔ دنیا داری اور اصحابِ اختیار و اقتدار کی خوشنودی کے حصول کا معاملہ بہر حال ہر دور میں رہا ہے۔ امامِ دارالہجرت امام مالکؒ کی جب مشکیں کَس کر' منہ پر سیاہی مَل کر گدھے پر سوار کر کے مدینہ کی گلیوں میں گھمایا گیا تھا' جب امام اعظم امام ابوحنیفہؒ کو جیل میں ڈالا گیا تھا' جب امام شافعیؒ کے لیے بار بار شہر بدر ہونے کے احکام جاری ہوتے رہتے تھے' جب امام احمد بن حنبلؒ کو قید و بند کی صعوبتیں جھیلنی پڑیں اور وہ مار سہنی پڑی کہ اگر ہاتھی کو بھی اس طرح مارا جائے تو وہ بلبلا اٹھے' جب امام ابن تیمیہؒ کو جیل میں ڈالا گیا اور وہیں انہوں نے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کی' جب مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کو قید کیا گیا' اور جب چند خوانین سرحد نے بیعت قبول کرنے کے باوصف بھی سید احمد بریلویؒ سے غداری کی تو کیا آپ کے خیال میں ان تمام افعال کی پشت پر علمائے سوء کے فتاویٰ موجود نہیں تھے جو وقت کے صاحبانِ اقتدار و اختیار کی خوشنودی کے لیے دیے گئے تھے؟ دنیا دار اور فتویٰ فروش علمائے سوء ہر دَور میں موجود رہے ہیں۔ ہمارا زمانہ تو ظاہر بات ہے کہ فتنہ کے اعتبار سے اپنی انتہا کو پہنچا ہوا ہے۔ علماءِ سو کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے اُمت کو پیشگی متنبہ فرما دیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول

اللہ ﷺ نے فرمایا:

((یُوْشِکُ اَنْ یَّاْتِیَ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ لَا یَبْقٰی مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اسْمُہٗ ، وَلَا یَبْقٰی مِنَ الْقُرْآنِ اِلَّا رَسْمُہٗ، مَسَاجِدُھُمْ عَامِرَۃٌ وَھِیَ خَرَابٌ مِنَ الْھُدٰی، عُلَمَاؤُھُمْ شَرُّ مَنْ تَحْتَ اَدِیْمِ السَّمَاءِ ، مِنْ عِنْدِھِمْ تَخْرُجُ الْفِتْنَۃُ وَفِیْھِمْ تَعُوْدُ))(۴)

''اندیشہ ہے کہ لوگوں کو ایک ایسے زمانے سے سابقہ پیش آئے گا کہ اسلام میں سے سوائے اس کے نام کے کچھ نہ بچے گا (اسلام پر عمل ختم ہو جائے گا' صرف اس کا نام باقی رہ جائے گا) اور قرآن میں سے سوائے اس کے رسم الخط کے کچھ نہ بچے گا (قرآن پر عمل ترک ہو جائے گا اور اس کے الفاظ کی محض تلاوت باقی رہ جائے گی)۔ مسلمانوں کی مسجدیں بظاہر آباد ہوں گی لیکن ہدایت سے خالی ہو جائیں گی۔ ان کے علماء آسمان کی چھت کے نیچے کے بدترین انسان ہوں گے۔ سارے فتنے ان ہی میں سے برآمد ہوں گے اور ان ہی میں لوٹ جائیں گے۔''

نبی اکرم ﷺ نے جہاں یہ انتباہ فرمایا وہاں یہ بشارت بھی دی کہ علمائے حقانی سے کوئی زمانہ خالی نہیں رہے گا۔ یہ ضمانت دی ہے محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے کہ: ((لَا تَزَالُ طَائِفَۃٌ مِّنْ اُمَّتِیْ ظَاھِرِیْنَ عَلَی الْحَقِّ))(۵) ''میری اُمت میں ہمیشہ ایک گروہ حق پر ثابت قدم رہے گا''۔ ظاہر بات ہے کہ علمائے حق کے بغیر دین کا کوئی تصور ہی نہیں' لہٰذا ہر دَور' ہر زمان' ہر مکان میں علمائے حقانی بھی لازماً موجود رہیں گے۔ پس یہ دونوں چیزیں اپنی جگہ پر ہیں۔ جہاں تک علمائے سوء کا معاملہ ہے' ان کی باتوں کی طرف توجہ دینے کی ضرورت نہیں ہے' لیکن اگر علمائے حق کی طرف سے تشویش کا اظہار ہو' اگر انہیں بھی خطرات وخدشات اور اندیشے محسوس ہوں تو یقیناً قابل غور مسئلہ ہے۔ ان علماءِ حق کی تشویش اگر وہ شخص نظر انداز کر دے گا جو خادمِ دین' خادمِ قرآن اور خادمِ ملت ہو تو وہ اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مارے گا' کسی اور کا نقصان نہیں کرے گا۔

اگر کوئی شخص یہ چاہتا ہے کہ اپنے دس بیس یا سو پچاس ہم خیال پیدا کر کے دنیا سے چلا جائے تو یہ ہر وہ شخص کر سکتا ہے جس میں ذرا سی ذہانت اور صلاحیت ہو۔ کچھ نہ کچھ لوگ اسے لازماً مل جائیں گے جو اُس کے حواری بن جائیں گے۔ لیکن اگر کسی شخص کے پیش نظر یہ ہے کہ دین کی ایک ہمہ گیر دعوت اٹھا کر اقامت دین اور اسلامی انقلاب کے لیے جدوجہد کرے تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ کوئی کودن اور احمق شخص ہی ہوگا جو یہ سمجھتا اور توقع رکھتا ہو کہ علمائے حق کی اشیر باد کے بغیر' علمائے حقانی کی تائید و تعاون کے بغیر اور اصحابِ علم و فضل کی دعاؤں کے بغیر کوئی ایسی تحریک پروان چڑھ سکے گی اور نتیجہ خیز ہو سکے گی۔ ایسی دعوت و تحریک کے داعی کے لیے' اگر وہ مخلص ہے' ان علمائے حقانی کا اعتماد حاصل کرنا لازم ہے۔ میں اس مسئلہ پر مسلسل غور کرتا رہا کہ آخر کیا بات ہے کہ جن حضراتِ گرامی کو میں علمائے حق گردانتا ہوں' جن سے حسنِ عقیدت رکھتا ہوں مجھے ان کا تعاون حاصل نہیں ہو رہا۔ بلکہ کبھی دبی دبی زبان سے اور کبھی برملا ان کی طرف سے اختلاف کا اظہار ہو رہا ہے۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے میری رہنمائی فرمائی اور یہ عقدہ کھل گیا کہ ان علمائے حقانی کے خدشات کا سبب وہ گمراہ کن نظریات اور تحریکیں ہیں جو اِس برعظیم پاک و ہند میں قریباً ایک صدی کے دوران وقتاً فوقتاً قرآن کے نام پر اٹھتی رہی ہیں۔ میں ان کی طرف ابتدا میں اشارہ کر چکا ہوں' اب میں قدرے تفصیل سے ان کے متعلق کچھ باتیں آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔

۱۸۵۷ء کے بعد جب مسلمانوں کی نام نہاد حکومت بالکل ختم ہوگئی اور برعظیم پاک و ہند پر سیاسی اعتبار سے حکومت برطانیہ کا تسلط و استیلاء کامل طور پر ہو گیا تو غلامی کا ایک نیا دَور شروع ہوا۔ ۱۹۴۷ء تک یہ نوے سال کا دَور ہے۔ اس دَور میں قرآن کے حوالے سے جو سب سے پہلی زوردار آواز اٹھی وہ سرسید احمد خان کی ہے۔ انہوں نے پندرہ پاروں کی تفسیر بھی لکھی۔ انہوں نے قرآن کی تفسیر میں طرح طرح کے فتنے اٹھا دیے۔ مثلاً جنات کا انکار' فرشتوں کا انکار' وحی کا قریباً انکار۔ انہوں نے ان سب کی ایسی توجیہہ و تاویل کی جو سراسر قرآن کے خلاف تھی' ظاہر بات ہے کہ کھلم کھلا انکار تو

کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ انہوں نے جنات کا برملا انکار نہیں کیا' لیکن یہ کہا کہ قرآن نے مشتعل مزاج اور اُجڈ قسم کے لوگوں کو ''جن'' سے تعبیر کیا ہے' وہ کوئی علیحدہ مخلوق نہیں ہے۔ فرشتوں کا بھی برملا انکار تو نہیں کیا' لیکن کہا کہ قوانینِ فطرت میں جو قوتیں (Forces of the Nature) کارفرما ہیں ان کو فرشتے کہا گیا ہے' ان کا کوئی علیحدہ وجود نہیں' وہ کوئی علیحدہ مخلوق نہیں۔ معجزات کی یہ تاویل کی گئی کہ یہ طبیعیات کے عجیب وغریب اور غیر معمولی مظاہر (Physical Phenomena) تھے' ان کو خواہ مخواہ معجزات سمجھ لیا گیا ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر سمندر سے نکل گئے اور فرعون کا لشکر غرق ہو گیا تو یہ مدّ و جزر کا کرشمہ تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جزر کی کیفیت میں بنی اسرائیل کے ساتھ سمندر عبور کر گئے' لیکن جب فرعون اپنے لشکر کو لے کر سمندر میں اترا تو سمندر مدّ پر آ گیا اور آلِ فرعون اس کی لہروں کی نذر ہو گئے۔ گویا اپنے دَور کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ مصری قوم مدّ و جزر سے ناواقف تھی۔ سرسید احمد خان نے ایسی گمراہ کن تاویلات کی ہیں' اگرچہ کھلم کھلا انکار کسی چیز کا نہیں کیا۔ ان کی پیدا کردہ گمراہیوں کی فہرست بڑی طویل ہے۔ میں نے اس موضوع پر ایک طویل مضمون لکھا تھا جو میری کتاب ''اسلام اور پاکستان'' میں شامل ہے۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے اپنی کتاب ''اسلام'' میں وحی کے بارے میں یہ گمراہ کن خیال ظاہر کیا تھا کہ قرآن سارے کا سارا بیک وقت خدا کا کلام بھی ہے اور کلامِ رسولؐ بھی' وحی ایک چشمہ کے مانند قلب محمدیؐ میں پھوٹی تھی۔ متذکرہ بالا مضمون میں مَیں نے لکھا تھا کہ اس گمراہی کا آغاز کرنے والے تو سرسید احمد خان ہیں' یہ گمراہی تو نمعلوم کتنی جگہ انڈے بچے دے چکی ہے۔ چنانچہ سرسید اس کے قائل نہیں تھے کہ جبریل امین علیہ السلام وحی لے کر نازل ہوتے تھے۔ اس طرح تو فرشتوں کا تشخص تسلیم کرنا پڑتا' جس کے وہ انکاری تھے۔ ان کا شعر ہے: ؎

ز جبریلِ امیں قرآں بہ پیغامے نمی خواہم
ہمہ گفتارِ معشوق است قرآنے کہ من دارم

''جو قرآن جبریل امین لے کر آئے مجھے وہ نہیں چاہیے۔ میرے پاس جو قرآن

ہے وہ تو سارے کا سارا میرے محبوب (محمد مصطفیٰ ﷺ) کی گفتگو ہے۔''

تفسیر قرآن میں ان گمراہ کن تأویلات کے باوجود ایک اچھی بات سرسید احمد خاں کے حق میں جاتی ہے کہ نہ تو انہوں نے کوئی دینی جماعت بنائی اور نہ ہی کسی دینی فرقے کا آغاز کیا۔ وہ اصل میں ایک سماجی مصلح (social reformer) اور مسلمانوں کے ایک قومی لیڈر کی حیثیت سے معروف ہوئے۔ چونکہ ان کا دینی معاملہ صرف نظریات کی حد تک رہا اور انہوں نے ان کی بنیاد پر کوئی تنظیم یا جماعت نہیں بنائی' لہٰذا انہوں نے ایک اجتماعی فتنے کی شکل اختیار نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے کرام نے ان کا زیادہ نوٹس نہیں لیا۔ پھر مسلمانانِ ہند پر دوسرے اعتبارات سے ان کے احسانات بھی ہیں' لہٰذا ان کے معاملہ میں کسی حد تک نرمی کا معاملہ کیا جاتا رہا۔

لیکن اس کے پہلو بہ پہلو برعظیم پاک و ہند میں جو ایک بڑا فتنہ اٹھا اس کا بانی تھا مرزا غلام احمد قادیانی آنجہانی۔ اس نے اپنی تحریک کا آغاز کیا تو قرآن کے نام پر بات شروع کی۔ اُس کے ابتدائی دَور کے دو شعر ملاحظہ کیجیے' جن سے معلوم ہوگا کہ شروع شروع میں اس نے اپنا اعتماد پیدا کرنے کے لیے کس طرح خدمت قرآن کا لبادہ اوڑھا۔ اس کا ایک شعر ہے: ؎

جمال و حسنِ قرآں نورِ جانِ ہر مسلماں ہے
قمر ہے چاند اوروں کا' ہمارا چاند قرآں ہے!

دوسرا شعر ہے: ؎

اے بے خبر بخدمتِ قرآں کمر بہ بند
زاں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نماند[٦]

''اے بے خبر مسلمان! قرآن کی خدمت کے لیے کمر کس کر تیار ہو جاؤ' اس سے پہلے کہ آواز لگائی جائے کہ فلاں شخص اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ (یعنی موت سے پہلے پہلے جو فرصت میسر ہے اسے قرآن کی خدمت کے لیے لگاؤ)''۔

اس سے اندازہ کیجیے کہ اس کی تکنیک کیا تھی۔ پھر اس نے آریہ سماجیوں اور عیسائی مشنریوں سے بڑے کامیاب مناظرے کیے۔ ان سب کا ذکر آپ کو اس کے

ابتدائی لٹریچر میں مل جائے گا۔لیکن اس شخص نے اپنا اعتماد پیدا کرنے کے بعد وہ گمراہی پھیلائی جو سرطان کی طرح جسدِ ملّی سے چمٹ گئی۔ جب لوگوں کا کثیر تعداد میں اس کی طرف رجوع ہوا اور عقیدت مندوں کی ایک معتد بہ تعداد اس کے گرد جمع ہوگئی تو اس کے دماغ کے اصل خنّاس نے ظہور شروع کیا۔ چنانچہ شیطان نے اس کی پیٹھ ٹھونکی اور سبز باغ دکھانے شروع کیے تو اس نے پے در پے دعووں کا آغاز کر دیا۔ کہیں مجدّد ہونے کا دعویٰ کیا تو کہیں مسیح موعود ہونے کا۔ پھر اس سے آگے بڑھ کر ظلی اور بروزی نبی ہونے کا دعویٰ کیا اور بالآخر صاحبِ وحی نبی ہونے کا دعویٰ کر بیٹھا۔بعض علمائے کرام اور اہل قلم نے اس کے لٹریچر سے اس کی گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والی تصویر پیش کی ہے۔ اس کی تحریروں کو پڑھ کر انسان حیران ہوتا ہے کہ ایسا شخص تو صحیح العقل انسان بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا' کجا یہ کہ اسے نبی مان لیا جائے۔ مزید حیرانی اس پر ہوتی ہے کہ بڑے بڑے پڑھے لکھے لوگ اس کے پیچھے لگ گئے اور اس پر بحیثیت نبی ایمان لے آئے۔ ان میں سے کوئی انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کا جج رہا ہے اور کوئی نوبل پرائز یافتہ ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ چونکہ مرزا غلام احمد کو انگریزی سرکار کی سرپرستی حاصل ہوگئی تھی لہٰذا اس کے متبعین کو حکومت کی طرف سے بڑی مراعات ملیں' ان کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے مواقع حاصل ہوئے اور وہ سرکاری ملازمتوں اور منصبوں پر فائز ہوتے رہے۔ اس طرح مرزا غلام احمد قادیانی پر ایمان لانا دُنیوی ترقی اور انگریزی دورِ حکومت میں اثر و رسوخ نیز اعلیٰ ملازمتوں کے حصول کا زینہ بن گیا۔ بہرحال دعوتِ قرآن کا نام لے کر اٹھنے والا یہ دوسرا فتنہ تھا جس سے مسلمانوں کو بہت بڑا چرکہ لگا۔

پھر ہمارے دَور میں غلام احمد پرویز نے جو گمراہی پھیلائی اور جو مسلسل پھیل رہی ہے وہ تو بالکل سامنے کی بات ہے۔ چکڑالویت' پرویزیت اور دوسرے منکرین سنت کے جو مختلف shades ہیں' ان کا تو سارے کا سارا اوڑھنا بچھونا قرآن کا نام ہے۔ ''قرآنی نظامِ ربوبیت'' کے عنوان سے وہ نظریۂ اشتراکیت اور الحاد کے علمبردار ہیں۔

ان کے نزدیک نبی اکرم ﷺ صرف اپنے دَور کی حد تک واجب الاطاعت تھے (معاذ اللہ!) اور وہ بھی ''مرکزِ ملت'' کی حیثیت سے نہ کہ رسول کی حیثیت سے۔ رسول کی حیثیت سے تو بس ان کا کام قرآن کو پہنچانا اور حالات وظروف کے مطابق اس کی عملی تعبیر (interpretation) کرنا تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے دنیا کو شریعت کا جو نظام دیا تھا' جس کا کامل ظہور خلافت راشدہ کے دورِ سعید میں ہوا' ان منکرین حدیث وسنت کے نزدیک وہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ ان کا موقف یہ ہے کہ اپنے دور کا ''مرکز ملت'' قرآن سے اصول لے کر شریعت کا نظام رائج کرنے کا مطلقاً مختار ومجاز ہے۔ صلوٰۃ' زکوٰۃ' صوم اور حج کو وہ مستقل ارکانِ اسلام تسلیم نہیں کرتے' بلکہ ان کی رائے میں احوال وظروف کے مطابق ان میں تغیر وتبدل ہوسکتا ہے اور لازماً ہونا چاہیے۔ یہ گمراہ کن تحریک قرآن کے نام پر اٹھی اور اسی نام پر وہ ہمارے معاشرے میں گمراہی پھیلا رہی ہے۔

اس طرح ہمارے علمائے حق کو پے بہ پے یہ جو چرکے لگے ہیں اور تجربات ہوئے ہیں' ان کی وجہ سے وہ اس معاملے میں بہت ہی متردّد اور فکرمند ہو جاتے ہیں کہ کچھ لوگ قرآن کا نام لے کر آگے آ رہے ہیں۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۶ میں یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ﴾ یعنی اس قرآن ہی کے ذریعے اللہ تعالیٰ بہت سوں کو گمراہ کرتا ہے اور اسی قرآن کے ذریعے بہت سوں کو ہدایت دیتا ہے۔ اصل میں فیصلہ کن چیز انسان کی اپنی باطنی کیفیت ہوتی ہے۔ اگر کسی شخص میں عجب ہے' تکبر ہے' استکبار ہے' شہرت ووجاہت طلبی ہے' کچھ بننے کی آرزو ہے' اپنی عقل وفہم پر اعتماد میں غلو ہے' اپنی بڑائی اور انفرادیت کے اظہار کی خواہش اور شوق ہے' وہ کسی پندار اور گھمنڈ میں مبتلا ہے تو اس کا چاہے صبح وشام قرآن مجید سے کتنا ہی اعتناء اور تعلق ہو' ایسا شخص آج نہیں تو کل خود بھی فتنے میں مبتلا ہوگا اور بہتوں کو فتنے میں مبتلا کرنے کا باعث بن جائے گا۔ لیکن اگر اس کی طبیعت میں خلوص واخلاص ہے' تواضع ہے' انکسار ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں قرآن کی جو خدمت کر رہا ہوں وہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کی

توفیق سے کر رہا ہوں' اس میں میرے کسی ذاتی کمال کو کوئی دخل نہیں ہے' تو اِن شاء اللہ العزیز قرآن مجید اس پر اپنی ہدایت روشن کرتا چلا جائے گا۔

گمراہ فرقوں اور تحریکوں کا طریق واردات

اب اس ضمن میں ایک اہم بات جان لیجیے کہ ان تمام گمراہ فرقوں اور تحریکوں کا اصل طریقۂ واردات (methodology) کیا ہے۔ اور یہ سب میں مشترک وصف ہے۔ اس مسئلہ پر میں اپنے غور و فکر کے نتائج اور اپنے خیالات وضاحت سے آپ حضرات کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ ان کا طریق کار یہ ہوتا ہے کہ کسی ایک آدھ مسئلہ کو پکڑ کر' جو اُمت میں متفق علیہ اور مجمع علیہ رہا ہے' اس پر شکوک و شبہات پیدا کر دیتے ہیں۔ اُمت کے تمام فقہائے کرام' محدثین عظام' علمائے حقانی اور مفسرین کرام سب کے سب اس مسئلہ کو مانتے چلے آ رہے ہیں' لیکن اس ایک مسئلہ کو اٹھا کر وہ لوگوں کو اس مغالطہ میں مبتلا کر دیتے ہیں کہ یہ بات غلط ہے۔ اس ایک تیر سے کتنے شکار ہو گئے؟ اگر آپ نے ایک متفق علیہ مسئلہ کے بارے میں لوگوں کو بدظن کر دیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے اپنے عقیدت مندوں کے ذہن و قلب میں یہ بات بٹھا دی کہ سارے فقہاء بے وقوف تھے' سارے محدثین ناسمجھ تھے' سارے مفسرین بے علم تھے' سارے علماءِ اُمت بے عقل تھے کہ اتنی سیدھی سی بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی جو ہمارے ممدوح کی سمجھ میں آئی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو عموماً ایسے لوگوں کو تمام اکابر اسلاف سے سوءِ ظن میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اس کے بعد یہ لوگ اُس بے لنگر جہاز کے مانند ہیں جو لہروں کے رحم و کرم پر ہے' لہریں اس جہاز کو جدھر چاہیں لے جائیں۔ یا کٹی ہوئی پتنگ کے موافق ہیں جو ہوا کے رحم و کرم پر ہے' وہ اسے جدھر چاہے لے جائے۔

اب جیسے ہی اسلاف سے بدظنی پیدا ہوئی شیطان کو موقع مل گیا کہ وہ گمراہی پر گمراہی کا دروازہ کھولتا چلا جائے اور ''ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ'' کا نقشہ جما دے۔ اس لیے کہ ان کے دلوں میں تو عظمت کا سکہ اپنے ممدوح کا بیٹھ جاتا ہے کہ جو بات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی سمجھ میں نہیں آئی' امام ابوحنیفہؒ کے پلے نہیں پڑی' امام

مالکؒ کے ذہن کی جہاں تک رسائی نہیں ہوئی' امام شافعیؒ جس کو سمجھنے سے قاصر رہے' امام احمد بن حنبلؒ جس کی تہہ تک نہ پہنچ پائے' مزید یہ کہ اُمت کے تمام قابل اعتماد مفسرین' چاہے وہ متقدمین میں سے ہوں یا متأخرین میں سے' جس بات کے فہم سے عاری رہے' تمام علمائے حقانی کی عقل جس بات کے سمجھنے سے عاجز رہی وہ آج ان کی سمجھ میں آئی ہے۔ وہ یہ سمجھنے لگ جاتے ہیں کہ قرنِ اوّل سے آج تک جس مسئلہ میں پوری اُمت کا تواتر کے ساتھ اجماع رہا ہے وہ غلط رہا ہے' اس مسئلہ کا صحیح عقدہ تو ہمارے ممدوح عالم دین اور مفسر قرآن پر منکشف ہوا ہے۔ عقیدت مند لوگ جب اجماعِ اُمت کے خلاف ایک مسئلہ میں اپنے ممدوح کی رائے کو مان لیں تو بہت آسان ہو گیا کہ وہ جو چاہے زہر گھول دے' جو کڑوی گولی چاہے اپنے عقیدت مندوں کے حلق سے اتروا دے۔ یہ ہے ان کا مشترک طریق کار (methodology)۔

ان لوگوں کو معتقدین کس طرح اور کہاں سے ملتے ہیں جو اس فتنہ کے فروغ کا ذریعہ بنتے ہیں' یہ بات بھی تجزیہ طلب ہے۔ عموماً وہ جدید تعلیم یافتہ لوگ جو دین کے نہ طالب علم ہوتے ہیں نہ انہوں نے خود دین کا بنیادی طور پر مطالعہ کیا ہوتا ہے' اس طرح کے فتنہ پردازوں کے حلقہ بگوش بن جاتے ہیں۔ دُنیوی تعلیم کے اعتبار سے وہ چاہے گریجویٹ ہوں یا ماسٹرز ڈگری رکھتے ہوں' علوم جدیدہ میں سے کسی علم میں پی ایچ ڈی ہوں' کوئی قانون میں بار ایٹ لاء ہو' کوئی ملکی آئین میں درجۂ تخصص رکھتا ہو' کسی نے سائنس اور انجینئرنگ کی اعلیٰ ترین ڈگریاں حاصل کی ہوں' لیکن دین کے بنیادی علم سے انہیں کوئی شغف نہیں ہوتا' اس کا کوئی فہم نہیں ہوتا' اس معاملہ میں بالکل کورے ہوتے ہیں' اِلّا ماشاءاللہ۔ زیادہ سے زیادہ تقلید آباء کے طور پر نماز روزے سے کچھ تعلق ہو تو ہو۔ اس طبقے کے متعلق ایک بزرگ بجا طور پر ''پڑھے لکھے جاہل'' کی اصطلاح استعمال کیا کرتے ہیں۔ اس لیے کہ دین کے اعتبار سے تو یہ اَن پڑھ ہیں۔ اس طبقے میں بہت سے ایسے لوگ ہیں کہ انہیں ناظرہ قرآن تک پڑھنا نہیں آتا۔ یہ طبقہ ہے جس میں سے اکثر لوگ فتنہ اٹھانے والوں کے پھندے میں پھنس جاتے ہیں۔ انہیں نظر آتا

ہے کہ یہ لوگ دین اور قرآن کے بڑے خادم ہیں' بڑے عالم ہیں' بڑے معقول لوگ ہیں' بڑے ذہین وفطین ہیں' ان کی ذہانت و فطانت کا دنیا میں لوہا مانا جا رہا ہے' لیکن چونکہ ان کا براہِ راست دین کا اپنا مطالعہ نہیں ہوتا لہٰذا جس شخص کو بھی انہوں نے اس طور سے مان لیا کہ دین کی فلاں اہم بات اس کی سمجھ میں آئی ہے جو آج تک کسی اور کی سمجھ میں نہیں آئی تھی تو پھر وہ شخص ایسے لوگوں کو جدھر چاہے لے جائے۔ پھر ایسے لوگ اندھے اور بہرے ہو کر اس کی پیروی کرتے ہیں۔ بغرضِ تفہیم میں چند مثالیں قدرے تفصیل سے پیش کرتا ہوں۔

سرسید احمد خان کا اس موقع پر میں تذکرہ نہیں کروں گا۔ وہ جن گمراہیوں کے بانی ومبانی تھے ان کو میں پہلے بیان کر چکا ہوں اور یہ بھی عرض کر چکا ہوں کہ ان کی ذات سے کوئی فرقہ' کوئی جماعت' کوئی تنظیم وجود میں نہیں آئی۔ انہوں نے سماجی طور پر مسلمانوں کی خدمت کو اپنا میدانِ عمل بنایا اور ہمیں اعتراف کرنا چاہیے کہ اس میدان میں انہوں نے مسلمانانِ پاک و ہند کی بڑی خدمات انجام دی ہیں۔ لہٰذا سرسید کی بات یہیں چھوڑ دیجیے۔

اب آپ دیکھئے مرزا غلام احمد قادیانی نے کیا کیا؟ اس نے جب ابتداءً قرآن کا نام لے کر اور آریہ سماجیوں اور عیسائیوں سے مناظرے کر کے اپنا ایک مقام بنا لیا اور معتد بہ افراد اُس کے حلقۂ ارادت وعقیدت سے وابستہ ہو گئے تو اس نے ایک مسئلہ اٹھایا۔ آپ کو معلوم ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کا اپنے جسدِ خاکی کے ساتھ زندہ آسمان پر اٹھا لیا جانا اور پھر قیامت سے قبل ان کا بعینہٖ بنفسِ نفیس دوبارہ آسمان سے نازل ہونا' یہ وہ مسئلہ ہے جو اُمت کا متفق علیہ عقیدہ ہے اور سلف سے لے کر خلف تک اس پر پوری اُمت کا اجماع چلا آ رہا ہے۔ اس کا قرآن حکیم میں بھی ذکر ہے اور متعدد احادیثِ صحیحہ صراحت کے ساتھ اس مسئلہ پر موجود ہیں۔ تمام فقہاءِ اُمتؒ' تمام محدثین کرامؒ اور اُمت کے تمام قابل اعتماد مفکرین ومفسرین اس کو مانتے ہیں' لیکن غلام احمد قادیانی نے ''رفع ونزولِ مسیح'' کے انکار کا مسئلہ کھڑا کر دیا۔ چونکہ وہ دَورِ سائنسی عقلیت پرستی

(scientific rationalism) کا دَور تھا اور سائنس بھی ابھی نیوٹن کے دور میں تھی‘ آئن سٹائن کا دَور شروع نہیں ہوا تھا‘ لہٰذا اُس زمانے میں یہ بات ایک انگریزی دان اور عقلیت زدہ شخص کے لیے بڑی عجیب سی تھی کہ ایک زندہ انسان آسمان پر اٹھایا جا سکتا ہے اور پھر وہ صدیوں بعد آسمان سے نازل ہوگا۔

تعلیم یافتہ لوگوں کو تو مرزا قادیانی نے یہ عقلی مغالطہ دیا اور عوام کو اس دلیل سے فریب دیا کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ سید المرسلین اور افضل الرسل ہیں‘ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ آنحضور ﷺ تو انتقال فرما جائیں اور آپؐ کا جسد اطہر لحد میں زیر زمین دفن ہو اور حضرت مسیحؑ اس خاکی جسم کے ساتھ آسمان پر زندہ ہوں! اس طرح تو حضرت مسیحؑ ہمارے رسولؐ سے افضل قرار پاتے ہیں۔ حضرت مسیحؑ کو اُن کے حواریوں نے صلیب سے اتار لیا تھا‘ وہ زندہ تھے۔ خفیہ طور پر ان کا علاج معالجہ ہوا۔ پھر وہ چھپتے چھپاتے بیت المقدس سے نکل گئے اور کشمیر میں آ کر آباد ہوئے‘ وہیں طبعی طور پر ان کی وفات ہوئی اور دفن ہوئے۔ ہمارے مولویوں نے اس بات کو نہیں سمجھا اور غلط تأویلات کرتے رہے۔ چنانچہ اس مسئلہ کو اُس نے خوب ہوا دی اور اس کے ذریعے سے اس نے اپنے معتقدین کو اسلاف سے کاٹ دیا۔ جب وہ لنگر کٹ گیا تو بے لنگر کا جہاز لہروں کے رحم و کرم پر ہے‘ وہ جس طرف چاہیں اسے لے جائیں۔ اس کے معتقدین نے سمجھ لیا کہ سب سے بڑھ کر عالم تو یہ ہے۔ اب اس نے بتدریج دعاوی شروع کیے۔ اس نے کہا کہ احادیث میں جس مسیح کے آنے کی خبر ہے وہ بذاتہٖ مسیح نہیں بلکہ مثیلِ مسیح ہے اور وہ مسیح موعود اور مثیلِ مسیح میں ہوں۔ نوبت بایں جا رسید کہ پھر وہ صاحبِ وحی نبی بن بیٹھا‘ ہزاروں ماننے والے اپنے گرد جمع کر لیے اور بہت سی خلقِ خدا کی گمراہی کا سبب بن گیا۔

غلام احمد پرویز نے بھی یہی طریق کار استعمال کیا۔ اس نے لونڈی غلاموں کا مسئلہ‘ یتیم پوتے کی وراثت‘ قتل مرتد اور تعددِ ازدواج جیسے مسائل کھڑے کر دیے۔ یہ وہ مسائل ہیں جو قرنِ اوّل سے تا امروز متفق علیہ رہے ہیں اور اہل سنت کے تمام فقہی

مکاتب کا ان پر اجماع ہے۔ یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ بڑا حساس (touchy) ہے' اس نے بڑے جذباتی اور جگرسوز (pathetic) انداز میں اپنے زورِ قلم سے یتیم پوتے کے لیے ہمدردیاں حاصل کیں۔ اس طرح قرآن کے نام پر ان تمام مجمع علیہ مسائل کے خلاف ایک محاذ بنا کر اس نے بہت سے لوگوں کو انکارِ حدیث وسنت کی ضلالت میں مبتلا کر دیا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ بھی شریعتِ اسلامی کی الف' با' تا بھی جانتے ہیں' وہ اس کی بنیادوں کو جانتے ہیں' اس کے دلائل سے واقف ہیں۔ لیکن ہمارے معاشرے کے ''پڑھے لکھے جاہل'' تو ایک کھلی چراگاہ کی مانند ہیں کہ کوئی بھی ذہین انسان اپنی انشاء پردازی اور اپنے خاص اسلوبِ نگارش کو کام میں لا کر دھواں دار کتابیں لکھے اور اس طبقے میں سے کثیر تعداد میں لوگوں کو اپنا ہم خیال بنا کر ایک جمعیت فراہم کر لے۔ اب خود سوچیے کہ جو لوگ قائل ہو گئے ان کے اذہان پر کیا اثرات مرتب ہوئے! ہلکے سے ہلکے انداز میں یہ تأثرات بیان کیے جائیں تو وہ یہ ہوں گے کہ ہمارے ائمہ کرام' فقہائے عظام' لائق احترام محدثین اور مفسرین بڑے بھولے بھالے تھے کہ ان کی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آئیں۔ ان کی حقیقت منکشف ہوئی ہے تو اس شخص پر ہوئی ہے! یہ ہے وہ طریق کار جس سے قرآن کے نام پر اٹھنے والی دعوتوں اور تحریکوں نے منفی انداز اختیار کیا' لوگوں کو اسلاف سے بدظن کر دیا اور ان کا حال کٹی ہوئی پتنگ کا سا ہو گیا کہ ہوا جدھر چاہے اس کو لے جائے۔

دورِ حاضر کے ایک مفسر قرآن کی لغزش

میرے لیے اس معاملے میں بہت بڑی تشویش والی بات ہو گئی تھی کہ ایک ایسے بزرگ نے بھی یہی روش اختیار کی جو خود مفسر قرآن ہیں۔ ان سے میرا طویل عرصے تک قریبی تعلق ورابطہ رہا ہے' میں نے ان کی خدمت بھی کی ہے اور اُن کے فکر کی بھی۔ میں نے ان کی کتابوں کو شائع بھی کیا ہے۔ ساری عمر قرآن کے پڑھنے پڑھانے میں بِتا کر آخر کار یہ ہوا کہ رجم کے متعلق انہوں نے یہ رائے دے دی کہ شادی شدہ اور غیر شادی شدہ زانی کے لیے اسلام میں حد علیحدہ علیحدہ نہیں ہے' بلکہ شادی شدہ زانی کے

لیے بھی وہی سوکوڑے ہیں جو قرآن میں آئے ہیں۔ رجم کا معاملہ تو تعزیر سے متعلق ہے' کوئی شخص غنڈہ ہو' اوّل درجے کا بدمعاش ہو' جو معاشرے میں سانڈ بنا پھرتا ہو لیکن پکڑ میں نہ آ رہا ہو' ایسا شخص جب پکڑ میں آ جائے گا تو وہ رجم کر دیا جائے گا' ورنہ رجم باقاعدہ حد نہیں ہے' عام شادی شدہ زانی کی سزا وہی سوکوڑے ہیں جو قرآن میں ہے۔ اللہ تعالیٰ ان بزرگ کو معاف کرے اور انہیں توفیق دے کہ وہ اس موقف سے رجوع کریں اور توبہ کریں۔(۷)

آدمی کے سر پر جب ایک فلسفہ سوار ہو جاتا ہے تو وہ تمام احتیاطوں کو نظرانداز کر کے اپنی رائے کے حق میں ایسی باتیں کہہ جاتا ہے جس کی اس سے توقع نہیں ہوتی۔ چنانچہ حضرت ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ جن کی توبہ کے متعلق نبی اکرم ﷺ کی صحیح روایت موجود ہے کہ اس نے وہ توبہ کی ہے کہ اگر ایک بڑے گروہ پر تقسیم کر دی جائے تو سب کے لیے کافی ہو جائے'(۸) ان صحابی کے لیے ان بزرگ نے اپنی تحقیق کے نتیجے میں اپنی تفسیر میں ''نہایت بدخصلت غنڈا'' کا لفظ استعمال کیا (نقل کفر' کفر نباشد)' یہاں تک لکھ دیا کہ ''روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ اور آپؐ کے صحابہؓ کسی غزوے کے لیے نکلتے تو یہ چپکے سے دبک کر بیٹھ رہتا اور مَردوں کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر شریف بہو بیٹیوں کا تعاقب کرتا۔ بعض روایات سے اس تعاقب کی نوعیت بھی واضح ہوتی ہے کہ اس طرح تعاقب کرتا جس طرح بکرا بکریوں کا کرتا ہے''۔ آگے اس سے بھی بڑھ کر ایک نہایت غیر شائستہ بات لکھی ہے۔ آگے اپنی تحقیق ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں: ''آنحضرت ﷺ کو اُس کی شرارتوں کی رپورٹ ملتی رہی' لیکن چونکہ کسی صریح قانون کی گرفت میں یہ نہیں آتا تھا اس وجہ سے آپؐ نے کوئی اقدام نہیں کیا۔ بالآخر یہ قانون کی گرفت میں آ گیا۔ آپؐ نے اس کو بلوا کر تیکھے انداز میں پوچھ گچھ کی۔ وہ تاڑ گیا کہ اب بات چھپانے سے نہیں چھپ سکتی اس وجہ سے اس نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا۔ جب اقرار کر لیا تو آپؐ نے اس کے لیے رجم کا حکم دے دیا''۔(۹)

ان بزرگ کا ایک مستقل حلقہ ہے۔ ان کے معتقدین موجود ہیں جو انہی کی

آنکھوں سے دیکھتے اوران ہی کے کانوں سے سنتے ہیں' ان کی رائے پر اندھا اعتماد رکھتے ہیں۔ چنانچہ اسی حلقے سے ایک نوجوان ایسے نکلے کہ انہوں نے آگے بڑھ کر جو جسارت کی ہے وہ بھی مسلمانوں کے کلیجے کو چھلنی کر دینے والی ہے۔ وہ اُس غامدیہ خاتون کے بارے میں کہتے ہیں کہ (معاذ اللہ) ''وہ چکلا چلاتی تھی'' جن کے بارے میں احادیث صحیحہ میں تفصیلات ملتی ہیں کہ وہ خود چل کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا ''حضورؐ! مجھ سے وہ خطا سرزد ہوگئی ہے جس کی سزا رجم ہے' مجھے پاک کر دیجیے' میں نہیں چاہتی کہ مجھے اس کی سزا آخرت میں ملے' مجھے اس گناہ سے یہیں پاک کر دیجیے!'' رسول اللہ ﷺ نے ہر طرح انہیں ٹالا کہ کیا کہہ رہی ہو! کہیں پاگل تو نہیں ہوگئی ہو؟ انہوں نے کہا حضورؐ مجھے تو اس گناہ سے حمل ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''حمل ہے تو قصور تمہارا ہے' اس ننھی جان کا کیا قصور ہے جو تمہارے پیٹ میں ہے۔ جاؤ وضع حمل کے بعد آنا''۔ وضع حمل کے بعد وہ اللہ کی بندی پھر آ گئی۔ آپ سوچیے کہ رجم کی سزا سے زیادہ سخت سزا واقعتاً اور کوئی نہیں۔ پتھر مار مار کر ہلاک کرنا' سنگسار کرنا۔ لیکن وہ اللہ کی بندی چل کر پھر آ رہی ہے کہ ''حضور بچے کی ولادت ہوگئی ہے' مجھے پاک کر دیجیے''۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ ''ابھی اس کا وجود تیرے وجود کا محتاج ہے' یہ زندہ کیسے رہے گا؟ جاؤ اس کو دودھ پلاؤ''۔ وہ اللہ کی بندی چلی گئی اور تیسری مرتبہ حاضر ہوئی تو بچہ اس کی گود میں تھا اور روٹی کا ٹکڑا بچے کے ہاتھ میں تھا۔ وہ عرض کرتی ہے کہ ''حضور ﷺ دیکھئے یہ بچہ اب اس قابل ہوگیا ہے کہ اپنی غذا حاصل کر سکتا ہے' یہ میرے دودھ کا محتاج نہیں رہا' مجھے پاک کر دیجیے''۔ میں اندازہ نہیں کر سکتا کہ اس خاتون کے رجم کا حکم دیتے وقت کتنا بڑا پتھر اپنے دل پر رکھا ہوگا محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے' جن کی شان خود اللہ تعالیٰ نے رؤف و رحیم بیان فرمائی ہے! لیکن حضور ﷺ نے شریعت کا تقاضا پورا فرمایا اور اس خاتون کو رجم کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ یہ خاتون جس کی توبہ مثالی توبہ ہے'[۱۰] جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خوفِ آخرت اس کے دل پر کس طرح نقش تھا' ان بزرگ کے حلقے کے ایک صاحب اپنے ممدوح کی

وکالت میں اس حد تک پہنچ گئے کہ انہوں نے اس صحابیہ خاتون کے بارے میں انتہائی شرمناک الفاظ استعمال کیے۔انہوں نے اس واقعہ سے متعلق صحیح احادیث کو یکسر مسترد کر دیا۔

شہر لاہور میں ایک اُبھرتا ہوا فتنہ

یہی صاحب جواَب ان بزرگ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہونے اور رجم کے معاملے میں ان کے سب سے بڑے ایڈووکیٹ ہونے کا ''شرف'' رکھتے ہیں' آج سے چند سال پہلے ایک بہت بڑا کارنامہ سرانجام دے چکے ہیں۔ وہ اپنے تئیں ائمہ اربعہ سے بھی خود کو بالاتر سمجھنے کے زعم میں مبتلا ہیں۔انہوں نے قرآن کے قانونِ وراثت پر ایک مضمون لکھا تھا جواُن کے رسالہ میں شائع ہوا تھا۔اس میں انہوں نے دعویٰ کیا تھا کہ قرآن کا قانونِ وراثت کسی کی سمجھ میں آج تک نہیں آیا' خاص طور پر ''کلالہ'' کے معنی تو آج تک کوئی سمجھ ہی نہیں سکا۔سورۃ النساء کی آیت ۱۲ کے آخر میں ''کلالہ'' کی وراثت کا حکم بیان ہوا ہے اور اس ضمن میں اسی سورۂ مبارکہ کی آخری آیت (۱۷۶) میں مزید وضاحت آئی ہے۔آخر میں اس توضیح کا سبب بیان فرمایا گیا: ﴿یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا﴾ ''اللہ (اس قانون کی) تمہارے لیے تبیین فرما رہا ہے' مبادا تم گمراہ ہو جاؤ''۔ان صاحب کا کہنا ہے کہ اس کے باوجود اُمت چودہ صدیوں تک گمراہ رہی' کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کلالہ کا قانون کیا ہے' اب میں اس کو بیان کر رہا ہوں۔ اب یہ نوجوان رجم کے معاملے میں ان بزرگ کے ہم نوا بھی ہو گئے اور ان کے حلقۂ معتقدین میں بھی شامل ہو گئے۔تو یہ ایک فتنہ ہے جو اِس وقت اسی شہر لاہور میں جڑیں پکڑ رہا ہے۔عموماً ہوتا یہ ہے کہ جب فتنہ کا آغاز ہو رہا ہوتا ہے تو توجہ نہیں ہوتی۔جب وہ فتنہ اپنی جڑیں زمین میں اُتار لیتا ہے اور اس کی شاخیں پھیل جاتی ہیں' تب کچھ لوگ اپنی کلہاڑیاں اور تیشے لے کر آتے ہیں' لیکن اُس وقت کچھ پیش نہیں جاتی' کیونکہ وہ فتنہ ایک مضبوط تناور درخت بن چکا ہوتا ہے' اس کی شاخیں بہت دور تک پھیل چکی ہوتی ہیں اور اس کی جڑیں کافی مضبوط ہو چکی ہوتی ہیں۔اسی لیے میں نے ضروری سمجھا کہ اس

فتنہ کے متعلق آپ حضرات کو بروقت خبردار اور آگاہ کر دوں۔ اس لیے کہ یہ کام بھی قرآن کے نام پر ہو رہا ہے اور اس کے لیے جو شور اور ہنگامہ ہے وہ بھی قرآن کے حوالے سے ہے۔ یہ ایک تازہ ترین مثال آ گئی ہے۔ اس کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ ایک معمولی مسئلہ ہے' اس پر اتنی تشویش کی ضرورت کیا ہے!(۱۱)

مرزا غلام احمد قادیانی کے بارے میں عرض کیا جا چکا ہے کہ اُس نے پہلے ایک ہی مسئلہ ''رفع ونزولِ مسیح'' کا کھڑا کر کے اپنے معتقدین کو اس اجماعی مسئلے کے متعلق شک وشبہ میں مبتلا کر دیا تھا اور ان کو اپنے ماضی اور اسلاف سے کاٹ دیا تھا۔ اسی مسئلہ کو منوا کر وہ درجہ بدرجہ آگے بڑھا۔ پہلے مجدّد ہونے کا دعویٰ کیا۔ جن لوگوں نے یہ دعویٰ مان لیا تو پھر ان کے حلق سے مسیح موعود' مثیلِ مسیح اور بالآخر نبی ہونے کے دعاوی تسلیم کرا لیے۔ ورنہ غور کیجیے کہ ختم نبوت اور رفع ونزولِ مسیحؑ کے سوا وہ اکثر ان چیزوں کو مانتے ہیں جو ہمارے ہاں تسلیم شدہ ہیں۔ نماز' روزہ' زکوٰۃ اور حج کے وہ قائل ہیں' قرآن کو ماننے کے وہ مدعی ہیں' کعبہ شریف کو اُمت کا مرکز تسلیم کرنے کے وہ معترف ہیں' اپنی عبادات کے مقام کو مسجد سے موسوم کرنے پر وہ عامل ہیں۔ یہ تو ہم نے ختم نبوت کے انکار کی وجہ سے ان کی تکفیر کر کے ان کو ملت اسلامیہ سے کاٹا ہے' اور بعد ازاں ایک صدارتی آرڈیننس کی رو سے ان کے لیے اسلامی اصطلاحات کے استعمال کو بھی خلافِ قانون قرار دے دیا گیا ہے۔ لہٰذا جان لیجیے کہ فتنہ کسی ایک یا چند مجمع علیہ مسائل کے مقابلے میں نئی اور اچھوتی بات زوردار طریقے اور مغالطہ آمیز طرزِ استدلال سے پیش کرنے ہی سے شروع ہوتا ہے۔ اس کو ہمارے معاشرے کے تعلیم یافتہ ''جہلاء'' کے حلق سے اُتروا دیا جائے تو پھر ایک ایسی چراگاہ مل جاتی ہے اور ایک ایسا میدان حاصل ہو جاتا ہے کہ اس میں شکاری جس طرح چاہیں شکار کھیلیں۔

میں یہ بات کئی بار عرض کر چکا ہوں اور آج پھر اس کا اعادہ کر رہا ہوں کہ میں عالمِ دین ہونے کا ہرگز مدعی نہیں ہوں۔ میں قرآن حکیم کا ایک ادنیٰ طالب علم اور خادم ہوں۔ میں نے اُمت کے موجودہ زوال کے اسباب پر قرآن وسنت کی روشنی میں غور

کیا تو جس تشخیص تک پہنچا وہ میں بیان کر چکا ہوں۔ مجھے اس کی تائید الحمدللہ حضرت شیخ الہندؒ سے ان کی عمر کے آخری دَور کے عزائم سے مل گئی اور میں اسی کام میں لگا ہوا ہوں۔ مجتہد ہونا تو بہت دُور کی بات ہے' فقہ کے متعلق میرا مطالعہ محدود ہے۔ چنانچہ میں فقہی مسائل کے متعلق استفسارات کے جواب دینے سے حتی الامکان اجتناب برتتا ہوں۔ میں نے اپنے رفقاء سے بھی کہہ رکھا ہے کہ جس فقہی مسلک پر آپ مطمئن ہیں اس پر عمل کیجیے' کوئی مسئلہ پیدا ہو تو اپنے مسلک کے مستند علماء اور دارالافتاء سے رجوع کیجیے—— پھر یہ کہ میری پختہ رائے ہے اور میں اس پر جازم ہوں کہ کسی مسئلہ پر اسلاف کی متفقہ رائے سے اختلاف' خواہ وہ کسی ایک مسئلہ ہی میں کیوں نہ ہو' انتہائی خطرناک ہے۔ اس طرح فتنوں کا آغاز ہوتا ہے۔ قادیانیت اور پرویزیت کے ناسور اسی طرح پیدا ہوئے۔ غور کیجیے کہ آج کل کے ہم لوگ جس نوعیت کے ہیں' ہماری سیرت و کردار کے جو معیارات ہیں' ان کے اعتبار سے کوئی مجتہدِ مطلق بن کر کھڑا ہو جائے اور خلفائے راشدین' ائمہ اربعہ' تمام محدثین اور مفسرین کی متفق علیہ اور مجمع علیہ رائے کے خلاف اپنی رائے ظاہر کر دے تو دینی اعتبار سے یہ کتنی خطرناک بات ہے! یہ تو تمام اسلاف کے فہم دین کے خلاف اظہارِ عدم اعتماد ہے۔ رجم کا مسئلہ وہ ہے کہ جس سے خوارج اور چند معتزلہ کے سوا کسی نے اختلاف نہیں کیا' اہل سنت کے تمام مسالک کے علاوہ سلفی مسالک کے ماننے والے بھی اس کو ''حد'' قرار دیتے ہیں' امام ابن حزم ظاہری رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ پھر اہل تشیع کے جتنے بھی shades ہیں وہ سب کے سب اس پر متفق ہیں کہ رجم حد ہے۔ ایسے متفق علیہ مسئلہ کے خلاف اپنا ''اجتہاد'' پیش کرنا—— یہ ہوتا ہے دراصل کسی فتنہ کے آغاز کا سبب!

ان بزرگ کے بارے میں تو میں یہ نہیں کہتا کہ ان کے پیش نظر کسی فتنہ کا آغاز ہے۔ وہ عمر کے جس اسٹیج پر ہیں وہ طبعی عمر کی قریباً آخری اسٹیج کے زمرے میں آتی ہے۔ حسرت ہوتی ہے تو اس بات پر کہ عمر کے آخری حصہ میں کوئی شخص ایسی کمائی لے کر اللہ تعالیٰ کے حضور میں پہنچے۔ یہ معاملہ یقیناً حسرت ناک اور افسوس ناک ہے۔

فتنے سے بچاؤ کے لیے پانچ اصول

اب میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس دہری مشکل (dilemma) کا حل کیا ہے! ایک طرف قرآن مجید اور سیرتِ مطہرہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دین کا جو بھی نتیجہ خیز' پائیدار اور مستقل کام ہوگا وہ قرآن کے ذریعے ہوگا۔ نبی اکرم ﷺ کا اساسی منہج انقلاب قرآن مجید تھا' از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلاً مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ.....﴾ (البقرۃ:۱۵۱) ''جیسا کہ ہم نے تم میں ایک رسول بھیجا تم ہی میں سے جو تمہیں ہماری آیات پڑھ کر سناتا ہے اور تمہیں پاک کرتا ہے اور تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے.....'' آنحضور ﷺ نے دعوت و تبلیغ اور تزکیہ و تربیت کا کام کیا تو قرآن کے ذریعے کیا' حکمت کی تعلیم دی تو قرآن کے ذریعے دی' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بنیانِ مرصوص بنایا تو قرآن کے ذریعے بنایا۔ اب اگر کوئی اس طرح کا کام کرنا چاہے گا تو قرآن مجید کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ پانچوں محاذوں کے لیے کارگر اور مؤثر تلوار ایک ہی ہے اور وہ قرآن ہے۔ ماضی قریب کے ہمارے دو اکابر یعنی شیخ الہند رحمہ اللہ اور علامہ اقبال مرحوم اسی کے مؤید ہیں کہ اُمت کی اصلاح اور تجدید کا کام اگر ہوگا تو قرآن کے ذریعے ہوگا۔ جبکہ دوسری طرف قرآن کے نام پر اٹھنے والی تحریکوں کا یہ حشر ہے۔ اسی وجہ سے علمائے کرام کے اندر ان کے بارے میں سوءِ ظن ہے اور وہ قرآن کے نام پر اٹھنے والی ہر دعوت اور تحریک سے خطرہ محسوس کرتے ہیں' اندیشوں اور خدشات میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ یہ شخص بھی کوئی نیا فتنہ کھڑا کر دے۔ میں جب اس نتیجے پر پہنچا تو اُس وقت سے مجھے علماء کرام کے اس موقف سے ایک ہمدری پیدا ہوگئی۔ لیکن اس عقدے کا حل کیا ہے؟ اس حل کے ضمن میں میرے سامنے ایک پانچ نکاتی پروگرام ہے۔ میں اس کو اِس اعتبار سے پیش کر رہا ہوں کہ لامحالہ کام تو قرآن مجید ہی کے ذریعے کرنا ہوگا' البتہ فتنے سے بچنے کے لیے پانچ اصول ملحوظ رکھنے ہوں گے اور پانچ اقدامات کرنے ہوں گے۔

(۱)اسلاف سے مضبوط تعلق: اسلاف کے ساتھ دلی محبت اور عقیدت و احترام کا ہمارا تعلق کسی طور سے بھی کٹنے نہ پائے۔اس کا اس درجہ اور اس حد تک اہتمام کیا جائے کہ اگر ہمارے بزرگوں کی کتابوں میں کوئی ایسی چیز نظر آ بھی جائے جو ہمارے لیے بظاہر قابلِ اعتراض ہو تو اوّلاً ہم اس کی بہتر سے بہتر تأویل کرنے کی کوشش کریں گے' اگر تأویل کی گنجائش موجود ہو۔لیکن اگر یہ ممکن نہ ہو تو ہم یہ رائے قائم کریں گے کہ یہ قابلِ اعتراض بات ان کی کتاب میں کسی اور نے شامل کر دی ہوگی۔اس لیے کہ تاریخی طور پر یہ ثابت ہے کہ اعداء نے بڑے پیمانے پر یہ کام کیے ہیں۔اس مسئلہ پر پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب نے بڑی تحقیق و تفتیش اور محنت و کاوش سے ''تاریخِ تصوف'' نامی کتاب لکھی تھی۔اس کتاب کا ایک باب ایسا تھا جسے کوئی سرکاری ادارہ شائع کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔اللہ تعالیٰ نے مجھے ہمت دی اور میں نے اسے شائع کر دیا۔اس باب کا عنوان ہے: ''اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش''۔میں آپ کو دعوت دوں گا کہ اس کا مطالعہ ضرور کریں۔اس میں چشتی صاحب مرحوم نے سینکڑوں مثالیں جمع کر دی ہیں کہ باطل پرست فرقوں خاص طور پر باطنیہ فرقے کے لوگوں اور غالی قسم کے اہل تشیّع نے اہل سنت کے صحیح العقیدہ صوفیاء کرام کی کتابوں میں ایسی باتیں شامل کر دی ہیں جو اُن کے مسلّمہ صحیح عقیدے اور منشاء کے خلاف ہیں۔معلوم ہوا کہ ایک سازش کے تحت ہمارے بہت سے بزرگوں کی کتابوں میں تدسیس و تحریف ہوئی ہے۔لہٰذا اسلاف میں سے کسی معتبر و معتمد عالم اور بزرگ کی کسی کتاب میں قرآن و سنت کے اعتبار سے کوئی قابل اعتراض بات نظر آئے گی تو اسے تدسیس و تحریف سمجھا جائے گا۔کسی معتمد علیہ بزرگ کی توہین کرنا' ان کی تنقیص کرنا' ان کے احترام کو مجروح کرنا یہ ایک بہت بڑا فتنہ ہے۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ اسلاف سے منقطع ہو کر انسان بے لنگر کا جہاز یا کٹی ہوئی پتنگ بن کر رہ جاتا ہے۔چنانچہ جن لوگوں کا اسلاف کے ساتھ ادب' احترام' تعظیم' اعتماد اور محبت کا تعلق کمزور پڑ جاتا ہے یا منقطع ہو جاتا ہے وہ بڑی آسانی سے فتنوں

کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس بات کو ہمیشہ ایک کسوٹی (criterion) کی حیثیت سے پیش نظر رکھیے اور جو شخص بھی دین کی کسی خدمت کا مدعی ہو اُس کو پرکھنے‘ اس کے خلوص کو جانچنے کا ایک معیار اور اصول یہ بھی بنا لیجیے کہ اس کی صحبت میں بیٹھنے سے‘ اس کی باتیں سننے سے‘ اس کی کتابیں پڑھنے سے آیا اَسلاف کے ساتھ دل میں احترام‘ محبت اور حسنِ ظن پیدا ہوتا ہے یا اس کے برعکس سوءِ ظن کا معاملہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ گویا اس بات کے لیے ایک اہم پہچان ہوگی کہ جو کام بھی خدمتِ دین یا قرآن کے نام پر اٹھایا گیا ہے آیا وہ صحیح رُخ پر جا رہا ہے یا غلط رُخ پر۔

(۲) فقہی معاملات میں اعتدال کی راہ: تقلیدِ جامد اور اجتہادِ مطلق کے درمیان ہمیں ایک معتدل راستہ اختیار کرنا ہوگا۔ تقلیدِ جامد سے میری مراد یہ ہے کہ بس ایک فقہ کو اس طرح پکڑ کر بیٹھے رہیں کہ اس سے ذرا بھی اِدھر یا اُدھر نہ خود ہوں گے نہ کسی کا ہونا برداشت کریں گے۔ گویا انسان اس معاملہ میں اتنا زُود حس اور الرجک ہو جائے کہ کسی دوسرے فقہ کی کوئی بات سامنے آئے تو ’’من دیگرم تو دیگری‘‘ والا معاملہ ہو جائے۔ یہ درحقیقت وحدتِ اُمت کے لیے سخت نقصان دہ ہے۔ رہا عوام کا معاملہ تو ان کے بارے میں مَیں کہوں گا کہ اتباعِ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نیت سے کسی ایک فقہ کو مستقلاً اختیار کر لیں تو مطلقاً کوئی حرج نہیں‘ بلکہ یہ ان کے لیے بہتر ہے۔ وہ تو اپنے مسلک کے معتمد علماء سے جا کر فتویٰ لیں گے‘ انہیں کیا معلوم کہ اس معاملہ میں امام ابوحنیفہ‘ امام مالک‘ امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کے دلائل کیا ہیں! اگر معلوم ہو بھی جائے تو ان میں اتنا فہم نہیں ہوتا کہ وہ موازنہ کر سکیں کہ کس کی دلیل قوی اور اقرب الی السنہ ہے۔ لہٰذا ان کے لیے عافیت اسی میں ہے کہ وہ ایک فقہ کی پیروی کریں۔ اس لیے کہ اہل سنت کے تمام فقہی مسالک و مکاتب کا ماٰخذ کتاب وسنت ہی ہے۔ جیسے میں نے ایمان کے ضمن میں عوام کے بارے میں عرض کیا تھا کہ کسی صاحب یقین وایمان کی صحبت بھی کفایت کر سکتی ہے‘ اسی طرح ان کے لیے کسی ایک فقہ کی پیروی کرنے میں مطلقاً کوئی حرج نہیں۔ البتہ ان پر یہ بات واضح کر دینی ضروری ہے کہ اہل سنت کے

تمام مسالک مبنی بر کتاب وسنت ہیں، تاکہ دوسرے مسلک کے پیروکاروں کے متعلق ان کے دلوں میں غیریت کا احساس بالکل پیدا نہ ہو۔

رہا ان حضرات کا معاملہ جو دین کے خادم ہیں، جو میدان میں آ کر دین کی خدمت کر رہے ہیں، جن کے سامنے اسلام کی نشأۃِ ثانیہ اور احیائے دین کی منزل ہے، انہیں تو یقیناً اس تقلیدِ جامد سے نکلنا پڑے گا۔ ان کو سمجھنا چاہیے کہ جب ہم اہل سنت کے تمام مسالک کو اپنا مشترکہ اثاثہ اور علمی ورثہ سمجھتے ہیں، ائمہ اربعہ کو اہل سنت کے امام مانتے ہیں اور امام بخاریؒ کی صحیح الجامع کو اصحّ الکُتبِ بعدَ کِتاب اللّٰہ تسلیم کرتے ہیں تو کم از کم ان پانچ دائروں کی حد تک تو اپنے قلب وذہن کو کشادہ اور وسیع کیا جائے۔

مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر کے حوالے سے، جو ''وحدتِ اُمت'' کے نام سے مطبوعہ موجود ہے، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے قرآن کی تبلیغ ودعوت کے بارے میں عزائم کا ذکر کیا جا چکا ہے جن کا اظہار حضرت شیخ الہندؒ نے اسارتِ مالٹا سے واپسی کے بعد دارالعلوم دیوبند میں علماء کے ایک اجتماع میں کیا تھا۔ اسی کتاب میں بیہقیٔ وقت مولانا انور شاہ کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ایسا واقعہ مفتی صاحبؒ نے بیان کیا ہے کہ اسے آبِ زر سے لکھا جائے تو بھی اس کی عظمت کا حق ادا نہیں ہوتا اور اس کو جس قدر عام کیا جائے اسی قدر اِن شاء اللہ ہمارے یہاں فقہی معاملات میں جو تشتّت وافتراق ہے، اس میں بڑی حد تک اعتدال آ سکتا ہے۔ مفتی صاحب راوی ہیں کہ حضرت انور شاہؒ ایک موقع پر بہت مغموم بیٹھے تھے۔ میں نے پوچھا: حضرت کیسا مزاج ہے؟ کہا: ''ہاں! ٹھیک ہی ہے، میاں، مزاج کیا پوچھتے ہو، عمر ضائع کر دی''۔ مفتی صاحبؒ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: حضرت! آپ کی ساری عمر علم کی خدمت میں، دین کی اشاعت میں گزری ہے۔ آپ کے شاگرد علماء ہیں، مشاہیر ہیں۔ اگر آپ کی عمر ضائع ہوئی تو کس کی عمر کام میں لگی؟ فرمایا: ''میں تمہیں صحیح کہتا ہوں کہ عمر ضائع کر دی!'' میں نے عرض کیا: حضرت بات کیا ہے؟ فرمایا:

''ہماری عمر کا، ہماری تقریروں کا، ہماری ساری کدوکاوش کا خلاصہ یہ رہا ہے کہ

دوسرے مسلکوں پر حنفیت کی ترجیح قائم کر دیں' امام ابوحنیفہؒ کے مسائل کے دلائل تلاش کریں۔ یہ رہا ہے محور ہماری کوششوں کا' تقریروں کا اور علمی زندگی کا! اب غور کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ کس چیز میں عمر برباد کی؟ ابوحنیفہؒ ہماری ترجیح کے محتاج ہیں کہ ہم ان پر کوئی احسان کریں؟ ان کو اللہ تعالیٰ نے جو مقام دیا ہے وہ مقام لوگوں سے خود اپنا لوہا منوائے گا' وہ تو ہمارے محتاج نہیں۔

اور امام شافعیؒ' امام احمد بن حنبلؒ اور دوسرے مسالک کے فقہاء جن کے مقابلے میں ہم یہ ترجیح قائم کرتے آئے ہیں' کیا حاصل ہے اس کا؟ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم زیادہ سے زیادہ اپنے مسلک کو صواب محتمل الخطأ (درست مسلک جس میں خطا کا احتمال موجود ہے) ثابت کر دیں اور دوسرے کے مسلک کو خطأ محتمل الصواب (غلط مسلک جس کے حق ہونے کا احتمال موجود ہے) کہیں' اس سے آگے کوئی نتیجہ نہیں ان تمام بحثوں' تدقیقات اور تحقیقات کا جن میں ہم مصروف ہیں''۔

پھر فرمایا:

''ارے میاں! اس کا تو کہیں حشر میں بھی راز نہیں کھلے گا کہ کون سا مسلک صواب تھا اور کون سا خطا' اجتہادی مسائل صرف یہی نہیں کہ دنیا میں ان کا فیصلہ نہیں ہوسکتا' دنیا میں بھی ہم تمام تر تحقیق و کاوش کے بعد یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی صحیح' یا یہ کہ یہ صحیح ہے' لیکن احتمال موجود ہے کہ یہ خطا ہو' اور وہ خطا ہے اس احتمال کے ساتھ کہ صواب ہو۔ دنیا میں تو یہ ہے ہی' قبر میں بھی منکر نکیر نہیں پوچھیں گے کہ رفع یدین حق تھا یا ترکِ رفع یدین حق تھا؟ آمین بالجہر حق تھی یا بالسّر حق تھی' برزخ میں بھی اس کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا اور قبر میں بھی یہ سوال نہیں ہوگا''۔

مفتی صاحب کہتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مزید الفاظ یہ تھے:

''اللہ تعالیٰ شافعیؒ کو رسوا کرے گا نہ ابوحنیفہؒ کو' نہ مالکؒ کو اور نہ احمد بن حنبلؒ کو' جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے علم کا انعام دیا ہے' جن کے ساتھ اپنی مخلوق کے بہت بڑے حصے کو لگا دیا ہے' جنہوں نے نورِ ہدایت چار سو پھیلایا ہے' جن کی

زندگیاں سنت کا نور پھیلانے میں گزریں' اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی کو رسوا نہیں کرے گا کہ وہاں میدانِ حشر میں کھڑا کر کے یہ معلوم کرے کہ ابوحنیفہؒ نے صحیح کہا تھا یا شافعیؒ نے غلط کہا تھا یا اس کے برعکس' یہ نہیں ہوگا''۔

وقت کی اہم اور شدید ترین ضرورت ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ کا قول اور حضرت مولانا انور شاہ کاشمیریؒ کے ان اقوال کو کم از کم دیوبندی اور تھانوی حلقوں میں جس قدر ممکن ہو پہنچایا جائے' تاکہ جو اِن حلقوں کے متوسلین اور عقیدت مند ہیں ان کی تو آنکھیں کھلیں کہ ہمارے یہ دو نہایت ہی قابلِ اعتماد متقی اور متدیّن اکابر اپنی عمر کے آخری دَور میں پہنچ کر اپنے تجربات کی روشنی میں کن نتائج تک پہنچے تھے! علمی اعتبار سے اور جہادِ حریت کے حوالے سے جہاں شیخ الہندؒ کا بلند ترین مقام سمجھا جاتا ہے وہاں حضرت انور شاہ صاحبؒ کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ محدث اور فقیہہ ہونے کے اعتبار سے وہ چودھویں صدی کی شخصیت نہیں ہیں بلکہ وہ تو پرانے دَور کی علمی شخصیتوں کے ہم پلہ شخصیت ہیں۔ انہیں بیہقیٔ وقت کہا جاتا ہے۔ ان بزرگوں نے اپنی عمر کے آخری دور میں جو باتیں کہی ہیں' کاش ان کے متوسلین تو کم از کم ان پر غور کریں' سوچیں اور اپنے طرزِ عمل میں ان اکابر کی باتوں کے پیشِ نظر خوشگوار اور صحت مند تبدیلی لانے کی فکر کریں! ان اقوال کی شہادت دینے والے بزرگ مفتیٔ اعظم پاکستان مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ ہیں' جن کے ثقہ راوی ہونے میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا۔

مولانا انور شاہ کاشمیریؒ کے خیالات کے پیشِ نظر تقلید جامد اور اجتہادِ مطلق کے مابین ایک معتدل راستہ نکالنا ہوگا' خاص طور پر اُن حضرات کو جو علمی میدان میں خدمتِ دین اور خدمتِ قرآن میں لگے ہوئے ہیں۔ میں اپنے بارے میں کہتا ہوں کہ میں نیم مقلد ہوں۔ یعنی میں مقلد ہوں پانچ کا' صرف ایک کا نہیں۔ چار تو اہل سنت کے متفق علیہ ائمہؒ ہیں' اور پانچویں امام بخاریؒ' جن کی کتاب کے متعلق سب مانتے ہیں کہ ''**اصح الکتب بعد کتاب اللّٰہ**''۔ میں ان پانچ کے دائرے کے اندر اندر رہنے میں اپنے لیے عافیت سمجھتا ہوں۔ اللہ کرے کہ مستقبل میں اللہ تعالیٰ کسی ایسی عظیم شخصیت کو کھڑا کر

دے جس کے تقویٰ، تدین، فہم دین، اصابت رائے اور خلوص و اخلاص پر اُمت کے بڑے حصے بالخصوص علمائے حق کی اکثریت کا اجماع ہو جائے تو وہ تمام فقہی مسالک میں عمیق غور وفکر کے بعد پوری للّٰہیت اور خدا ترسی کے ساتھ اُمت کو ایک فقہی مسلک پر مجتمع کر دے۔ ایسی شخصیت کا یہ مقام ہوگا کہ وہ کسی مسئلہ کے متعلق دین کے دائرے کے اندر اجتہادِ مطلق کر سکے۔ اس دَور میں ہم جیسے کم علم اس طرح کی حرکت کریں گے تو دین کے خلاف بغاوت اور ایک بہت بڑے فتنے کا آغاز کرنے کا باعث بنیں گے۔ چنانچہ عافیت اسی میں ہے کہ رہیں اس دائرے کے اندر، لیکن یہ نہیں کہ بس ایک ہی فقہ کا دائرہ ہو۔ عوام کا معاملہ اور ہے، وہ اپنے اپنے مسلک کے مطابق عمل کریں اور روز مرّہ کے مسائل میں اپنے مسلک کے معتمد علماء کی طرف رجوع کریں۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ یہی ہدایت میں نے تنظیم اسلامی کے رفقاء کو دی ہے۔ فقہی مسائل کے بارے میں مَیں اپنی رائے کے اظہار سے بھی حتی الامکان گریز کرتا ہوں۔ البتہ میرا ایک مزاج ہے اور میں اسے چھپانا نہیں چاہتا کہ میں مقلد محض نہیں ہوں، میں نیم مقلد ہوں۔ میں ان پانچوں ائمہ کا مقلد ہوں اور ان پانچوں کے دائروں سے باہر جانے کو میں غلط سمجھتا ہوں۔ یہ ہماری مشترک متاع ہے۔ ان دائروں کے اندر اندر جس کی رائے کو بھی اقرب الی السنۃ اور اقرب الی الصواب سمجھتا ہوں، اسے ترجیح دیتا ہوں۔

(۳) دعوت الی القرآن کے چند اصول: اس پروگرام کی تیسری شق دعوت رجوع الی القرآن سے متعلق ہے۔ میں نے اشارہ کیا تھا کہ جب میں نے اس دعوت کا آغاز کیا تھا تو چند اصول پلّے باندھ لیے تھے۔ کام کے ساتھ ساتھ بفضلہٖ تعالیٰ ان اصولوں پر وثوق حاصل ہوتا رہا اور اللہ کی توفیق سے چند اور اصول بھی سامنے آتے رہے، جن کو میں نے ہمیشہ پیشِ نظر رکھنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔ وہ اہم اصول پیش کیے دیتا ہوں۔

دعوت رجوع الی القرآن کا ایک تعلق احکام سے ہے۔ اس ضمن میں میرا ایک مستقل اور اٹل موقف رہا ہے اور وہ بالکل منطقی ہے کہ اس کا سارا دارومدار اور تعلق نبی

اکرم ﷺ کے عمل سے ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جو لوگ آنحضور ﷺ سے جتنے زیادہ قریب تھے‘ اسی نسبت سے سب سے زیادہ استفادہ انہوں نے کیا۔ یہ تھے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم۔ نمبر دو پر تابعین ہیں جو صحابہ کرامؓ کے تربیت وصحبت یافتہ تھے اور نمبر تین پر آتے ہیں تبع تابعین۔ یعنی تابعین سے مستفیض ومستفید ہونے والے اور تربیت پانے والے حضرات رحمۃ اللہ علیہم اجمعین ——— اسی کی وضاحت ہے جو نبی اکرم ﷺ کے ایک ارشاد میں ہمیں ان الفاظ میں ملتی ہے: ((خَيْرُ أُمَّتِي قَرْنِي ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ))(۱۲) جو جتنا دُور تھا اس کا فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے‘ جو جتنا قریب ہے وہ اتنا ہی قابل اعتماد ہے۔ اس نے اگر حضور ﷺ کو نہیں دیکھا تو حضور ﷺ کے تربیت یافتہ لوگوں کو دیکھا ہے‘ ان کی صحبت اٹھائی ہے۔ اگر ان کو نہیں دیکھا تو ان کے تربیت یافتہ لوگوں کو دیکھا ہے‘ ان سے فیض اور افادہ حاصل کیا ہے۔ تو اُمت کا یہ جو تواترِ عمل ہے یہ سنت کو معلوم کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ لہٰذا احکامِ دین کا جہاں تک تعلق ہے‘ اس میں کوئی نئی بات کہنا فتنہ اور فساد کی اصل جڑ ہے۔ اس میں تو کوشش ہو کہ پیچھے سے پیچھے جاؤ‘ حتیٰ کہ پہنچ جاؤ محمدٌ رسول اللہ ﷺ تک: ؎

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اُو نرسیدی تمام بولہبی ست!

جہاں تک دین پر عمل کا تعلق ہے تو میں عرض کر دوں کہ قرآن حکیم کی وہ آیات ایک پارے کے بقدر بھی نہیں بنیں گی جو عملی طور پر احکام دین سے متعلق ہیں‘ جن سے فقہی مسائل کا استنباط ہوتا ہے۔ اصل میں عمل کا سارا دار و مدار سنتِ رسولؐ پر ہے۔ قرآن مجید میں نماز کی کتنی تاکید ہے۔ اسے ہر وہ شخص جانتا ہے جس کا دین سے ذرا بھی تعلق ہے‘ بلکہ اس بات کو تو وہ بھی جانتے ہیں جن کا دین سے عملی تعلق منقطع ہے۔ لیکن نماز کی ہیئت اور ترتیب کہاں سے ملے گی؟ اوقات کہاں سے ملیں گے؟ قرآن میں اشارات ہیں‘ لیکن نماز سے متعلق پورا نظام سنتِ رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے ملے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ))(۱۳) ’’نماز

پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے دیکھتے ہو‘‘۔ چنانچہ جہاں تک احکامِ دین اور فقہی مسائل کا تعلق ہے وہ سنت میں ملیں گے۔ سنت ہی احکامِ قرآن کی عملی تفسیر ہے‘ اسی سے استنباط ہوگا‘ استشہاد ہوگا‘ حتیٰ کہ اجتہاد ہوگا۔ لہٰذا اس معاملہ میں پیچھے سے پیچھے جائیے‘ آگے مت جائیے! احکام کے بارے میں ائمۂ مجتہدین اور محدثین کے دائرے سے باہر قدم نہ نکالیے۔

دوسرا یہ اصول میں نے گرہ میں باندھ رکھا ہے کہ قرآن اور احادیثِ صحیحہ میں جو معجزات‘ خرقِ عادت اور محیر العقول برکات و واقعات مذکور ہیں‘ ان سب پر ہمیں حرف بہ حرف (literally) ایمان لانا ہوگا۔ اس لیے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور وہ جس ربّ العالمین اور خالقِ کائنات کا انسان سے تعارف کراتا ہے وہ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ کی شان کا بھی حامل ہے‘ وہ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ بھی ہے‘ اور صرف وہی اَلْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ اور اَلْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ہے۔ لہٰذا اس معاملہ میں مَیں کسی تأویل کا روادار نہیں۔ ان کو جوں کا توں قبول کرنا میں ایمان کا لازمی جزو سمجھتا ہوں۔

تیسری بات یہ کہ قرآن مجید میں جن انبیاء و رُسل علیہم السلام اور جن اقوام و ملل کا ذکر ہے وہ بطورِ تذکیر اور بطورِ عبرت ہے۔ قرآن تاریخ یا جغرافیہ کی کتاب نہیں ہے کہ جس میں تمام معلومات جمع کر دی گئی ہوں۔ اس ضمن میں میری رائے ہے کہ تمدن کی ترقی کے ساتھ علم‘ جستجو‘ تحقیق اور معلومات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا آ رہا ہے اور ہوتا چلا جائے گا۔ لہٰذا اس معاملے میں اگر ہمارے متقدمین علماء‘ محققین اور مفسرین کی آراء موجودہ تحقیقات و معلومات اور فراہم شدہ data سے مطابقت نہ رکھتی ہوں تو یہ بالکل فطری بات ہے‘ اس سے متوحش اور تشویش میں مبتلا ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ اِن شاء اللہ جوں جوں تحقیقات و معلومات کا دائرہ وسیع ہوگا اس کے نتیجہ میں قرآن مجید کی حقانیت مزید مبرہن ہوتی چلی جائے گی‘ قرآن میں جو اشارات ہیں وہ کھلتے چلے جائیں گے اور جو اجمال ہے وہ واضح ہوتا چلا جائے گا۔

اسی طرح قرآن حکیم سائنس کی کتاب بھی نہیں ہے۔ اصلاً یہ کتابِ ہدایت ہے‘

ھُدًی لِّلنَّاسِ ہے' لیکن یہ خالقِ کائنات کا کلام ہے' لہٰذا اس میں سائنسی مظاہر (scientific phenomena) کی طرف جابجا اشارے کیے گئے ہیں۔ کوئی اشارہ جیالوجی سے متعلق ہے' کوئی چیز علم فلکیات کے میدان کی ہے' کوئی چیز بیالوجی سے تعلق رکھتی ہے تو کوئی چیز فزیالوجی اور کوئی ایمبریالوجی (جنینیات) کے دائرے کی ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ قرآنِ مجید میں علم الجنین کا کتنی بار حوالہ آیا ہے اور رحم مادر میں جنین کے مختلف مراحل بیان ہوئے ہیں کہ وہ پہلے نُطفہ ہوتا ہے' پھر عَلقہ بنتا ہے' پھر مُضغہ کی صورت اختیار کرتا ہے' پھر عِظام (ہڈیوں) کا مرحلہ آتا ہے' پھر ان ہڈیوں پر لحم (گوشت) چڑھتا ہے' پھر وہ زندہ انسان کی صورت میں رحم مادر سے تولّد ہو جاتا ہے۔ الغرض جتنے بھی سائنٹیفک پہلو اور گوشے ہیں' ان سب کے متعلق قرآن مجید میں اشارات موجود ہیں۔ ان کے متعلق جدید تحقیقات کی روشنی میں اگر یہ رائے دی جائے کہ ہمارے متقدمین علماء ومفسرین ان امور کو سمجھ نہ پائے تو یہ کوئی اچنبھے اور حیرانی والی بات نہیں۔ ان کے زمانے میں سائنس کا علم جس سٹیج پر تھا ظاہر بات ہے کہ وہ اسی کے مطابق قرآن مجید کے اشارات کی توجیہہ وتأویل اور تشریح وتوضیح کرتے رہے۔ ان کے دَور تک سائنسی معلومات کا دائرہ بہت محدود تھا۔ اس سے آگے وہ کیسے جاتے؟ کسی کے لیے بھی اپنے دور کی موجود معلومات کے دائرے سے آگے جانا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ سات آسمانوں کی انہوں نے جو تعبیر کی' برجوں کی انہوں نے جو توجیہہ کی' ﴿كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝۳۳﴾ (الانبیاء) کی جو تعبیر کی یا جو بھی انہوں نے ﴿سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ﴾ (الجاثیۃ:۱۳) کا مفہوم سمجھا' ان سب کو انہوں نے اُس وقت کے فراہم شدہ data کی روشنی میں سمجھا اور بیان کیا۔ سائنس نے ہمارے دور میں جو ترقی کی ہے اور جدید تحقیقات کے نتیجے میں جو انکشافات کیے ہیں ان کی روشنی میں اب ان آیات کی جو تعبیر اور توجیہہ کی جائے گی' جو مفہوم بیان کیا جائے گا تو یہ بات غلط نہیں ہوگی اور نہ اس سے ہمارے متقدمین کی کوئی توہین یا تنقیص ہوگی۔ عین ممکن ہے کہ مستقبل میں چند ایسے حقائق سامنے آئیں جو

موجودہ تحقیقات سے بھی آگے کے ہوں۔اس طرح قرآن کے عجائبات بھی مزید واضح ہوتے رہیں گے۔

اسی طرح قرآن حکیم تخلیق کائنات کے جواَدوار اور تخلیق آدم کے جو مدارج بیان کرتا ہے' پھر آفاق وانفس سے توحید باری تعالیٰ کے متعلق جو بدیہی اور فطری استدلال پیش کرتا ہے' ان سب کو جدید دور کے مسلّمہ اکتشافات' تجربات اور سائنسی حقائق کی روشنی میں موجودہ تعلیم یافتہ طبقے کی تفہیم وتعلیم کے لیے جدید اصطلاحات کے حوالے سے بیان کرنا ہوگا۔یہی ابلاغ کا تقاضا ہے' لہٰذا اس کو اختیار کرنا ضروری ہے۔

اسی طرح موجودہ دَور کے تمام مادہ پرستانہ نظریات' ملحدانہ افکار اور طاغوتی نظام ہائے زندگی کے مقابلے میں قرآن کی انقلابی دعوتِ توحید پر ایمان لانے اور پھر اس ایمان وایقان کے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے متعلق جو مقتضیات' مضمرات' مطالبات اور توحید کی جو فروع (corollaries) ہیں' اس کے جو صریحی ومنطقی اور بدیہی نتائج ہیں' ان کو موجودہ دَور کی اصطلاحات کے حوالے سے پیش کرنا ضروری ہے۔یعنی اوّلاً تمام بنی نوعِ انسان کی اللہ کے بندے اور آدم کی اولاد ہونے کے ناطے کامل مساوات۔اللہ کے نزدیک اکرم واشرف وہ ہے جو اللہ کا سب سے زیادہ تقویٰ اختیار کرنے والا ہو۔ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ﴾ (الحجرات:۱۳) ——— ثانیاً انسان کی ہر نوع کی حاکمیتِ مطلقہ کی نفی۔یعنی ﴿اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ﴾ کا اثبات اور اس کی توضیح وتشریح اور حاکمیت کی جگہ خلافت کا تصور۔ ثالثاً ملکیت مطلقہ کی نفی اور ﴿لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ﴾ کی تشریح اور ملکیت مطلقہ کی جگہ امانت کا تصور۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے قرآن کی عظمت کے بارے میں جو ایک طویل حدیث آئی ہے اس میں وارد جو الفاظ ہیں ((وَلَا یَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ وَلَا یَخْلَقُ عَنْ کَثْرَةِ الرَّدِّ وَلَا تَنْقَضِیْ عَجَائِبُهٗ))(۱۴) یعنی ''علماء کبھی اس کتاب سے سیر نہ ہوسکیں گے' نہ کثرت و تکرارِ تلاوت سے اس کے لطف میں کوئی کمی آئے گی اور نہ ہی اس کے عجائبات یعنی

نئے نئے علوم و معارف کا خزانہ کبھی ختم ہو سکے گا'' تو میرے نزدیک اس کا حقیقی مفہوم یہی ہے کہ دنیا میں قرآن مجید' فرقان حمید ہی اس ہدایت کی حامل کتاب ہے جو ہر دور کے مشرکانہ' خدانا آشنا اور ملحدانہ نظام ہائے زندگی کے مقابلے میں انسان کی رہنمائی اور فلاح کے لیے توحید پر مبنی' ہر نوع کے استحصال' تعدّی اور استبداد سے پاک اجتماعی نظامِ عدل و قسط پیش کرتا ہے۔ اسی نظام کو بالفعل قائم کرنے کی جدوجہد ہی اقامتِ دین کی جدوجہد ہے۔ اور میری پختہ رائے ہے کہ جب تک موجودہ اصطلاحات کے حوالے سے دین حق کو دنیا کے سامنے پیش نہیں کیا جائے گا نہ دعوت وتبلیغ کا کما حقہٗ حق ادا ہوگا' نہ ابطالِ باطل ہوگا نہ احقاقِ حق ـــــــ چنانچہ میں اپنی دعوت میں ان تمام امور کو ملحوظ رکھتا ہوں اور اِن شاء اللہ رکھوں گا۔ میرے نزدیک اسی طرزِ فکر و عمل کا نام ہے حکمتِ دین!

میں نے آج یہ باتیں آپ کے سامنے قدرے تفصیل سے مربوط طریقے سے بیان کی ہیں۔ تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ میں جو کچھ بھی اپنی استعداد و استطاعت کے مطابق کام کر رہا ہوں اور دن رات جس کام اور جس دعوت کی دُھن مجھ پر مسلط ہے وہ بحمداللہ انہی اصولوں کے تحت ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اپنے خزانۂ فضل سے مزید توفیق و ہمت دے کہ اُس کی کتابِ عزیز کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر سکوں اور اس کے علوم و معارف کی توضیح و تشریح کی سعادت پا سکوں اور اسی حال میں آخرت کے لیے رختِ سفر باندھوں۔

(۴) علماء کرام سے ربط وضبط: چوتھا نکتہ یہ ہے کہ اس دورِ فتن میں ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾ (الروم:۴۱) کا نقشہ ہماری نگاہوں کے سامنے ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ خدانا آشنا اور ملحدانہ نظریات وافکار' تہذیب وتمدن اور نظام ہائے زندگی کے باعث پوری دنیا میں فساد رونما ہو چکا ہے' انسانیت تیزی کے ساتھ ہلاکت خیزی کی طرف چلی جا رہی ہے۔ اُمت مسلمہ جو امر بالمعروف' نہی عن المنکر' دعوت الی اللہ اور دعوت الی الخیر کے لیے برپا کی گئی تھی وہ خود خوابِ غفلت میں پڑی ہوئی ہے۔ لہٰذا اس دور میں

کرنے کا اصل کام ہے نوعِ انسانی کو دعوتِ توحید و ایمان دینا اور توحید علمی و عملی کو بالفعل قائم کرنے کی جدوجہد کرنا۔ اسی کا نام تکبیر ربّ ہے' اسی کا نام اظہار دین الحق علی الدین کلہ ہے۔

اب جو بھی دعوت اور تحریک اس مقصد کو لے کر اٹھے اس کے سربراہ اور رفقاء کو اپنے اوپر لازم کر لینا چاہیے کہ وہ علماءِ حق سے ربط و ضبط رکھیں گے' اپنے اوقات و مصروفیات میں سے وقت نکال کر ان کی خدمت میں حاضری دیں گے اور ان سے رہنمائی حاصل کریں گے۔ معلوم کریں گے کہ ان کے مغالطے کیا ہیں اور ان کے خدشات کی نوعیت کیا ہے! بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ انہیں کوئی غلط بات پہنچا دی جاتی ہے' ہمارے موقف کے متعلق انہیں مغالطے دے دیے جاتے ہیں اور وہ اپنی نیک نیتی سے راویوں پر اعتماد کر کے ان غلط خبروں کو درست مان لیتے ہیں۔ اس لیے کہ جو شخص خود نیک نیت ہوتا ہے وہ دوسروں کے ساتھ بھی حسنِ ظن کا معاملہ کرتا ہے۔

میں نے تنظیم اسلامی میں شمولیت کے لیے بیعت کا جو طریقہ اختیار کر رکھا ہے کچھ عرصہ قبل اس کے خلاف اخبارات میں تین علماء کا فتویٰ شائع ہوا تھا' جس میں بیعت کے طریقہ کار کو کسی دینی ہیئتِ اجتماعی کی تشکیل کے لیے غلط قرار دیا گیا تھا۔ اس ضمن میں جب میں نے ایک عالمِ دین سے رجوع کیا' ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے بتایا کہ مجھے تو وہ بیان دکھایا ہی نہیں گیا' مجھے تو فلاں صاحب نے ٹیلی فون پر کچھ بتایا تھا' اس میں بیعت کا مسئلہ تھا ہی نہیں' انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا کہ اس پر آپ کا نام بھی دے دیا جائے؟ انہوں نے جن صاحب کا نام لیا وہ بھی ایک بڑی مذہبی شخصیت ہیں' لہٰذا انہوں نے نیک نیتی سے سمجھا کہ اتنی بڑی شخصیت جو بات بتا رہی ہے وہ صحیح ہو گی' اس لیے انہوں نے اپنے نام کی شمولیت کی منظوری دے دی۔ چنانچہ ان کی خدمت میں حاضری کا یہ فائدہ ہوا کہ پھر ان بزرگ نے اپنا تردیدی بیان اخبارات کو جاری کرایا کہ ''میرے نزدیک دینی ہیئتِ اجتماعیہ کے لیے بیعت کا طریق کار اختیار کرنے میں شرعی نقطۂ نظر سے قطعاً کوئی قباحت نہیں ہے''۔ یہ بات ان بزرگ کی نیک نفسی اور

خلوص کی دلیل ہے۔ اگر میں ان کی خدمت میں حاضر نہ ہوا ہوتا تو یہ غلط بات آگے بڑھتی اور اس کے نمعلوم کہاں کہاں اور کیا کیا اثرات مترتب ہوتے۔ لیکن ربط وضبط کے ذریعہ سے مغالطوں اور سوءِظن کو اگر بالکل نہیں تو بہت حد تک کم کیا جا سکتا ہے۔ میں ان صاحب کے پاس بھی گیا جنہوں نے ٹیلی فون پر ان عالمِ دین سے گفتگو کی تھی۔ ان سے تبادلۂ خیال کیا اور افہام وتفہیم کی کوشش بھی کی' جو اگرچہ نتیجہ خیز نہیں ہوئی لیکن بہرحال میں نے دلائل کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر اُن کے سامنے رکھ دیا۔

(۵) علماءِ حق کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش: پانچویں اور آخری نکتے کے متعلق میں پوری دیانت داری سے عرض کرتا ہوں کہ میرا موقف یہ ہے کہ ہر وہ دعوت جو اقامت دین کو اپنا ہدف بنا کر کھڑی ہوئی ہو' اس کے لیے صرف وقتی تدبیر کے طور پر نہیں' بلکہ قلب کی گہرائیوں سے لازم ہے کہ علمائے حق کا اعتماد کرنے کے لیے بھرپور کوشش کرے۔ میں دعوے کے ساتھ یہ بات کہہ رہا ہوں کہ کوئی بھی شخص اُس وقت تک اُمت کے اندر دین کا کوئی مؤثر کام نہیں کر سکے گا جب تک وہ ان علماء کا اعتماد حاصل نہ کرے جن کے متعلق اسے یہ یقین ہو کہ ان میں للّٰہیت ہے' خلوص و اخلاص ہے' تقویٰ ہے اور ان میں انانیت ونفسانیت نہیں ہے۔ چھوڑ دیجیے ان کو جو علمائے سوء ہیں' جن کو اپنی گدیوں کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے' جنہیں یہ اندیشہ ہر وقت پریشان کیے رکھتا ہے کہ ہمارے گلے کی بھیڑیں ٹوٹ کر کسی اور کے گلے میں شامل نہ ہو جائیں۔ جہاں تک ہمارے علمائے حقانی کے اندیشوں اور خدشات کا تعلق ہے' اس کے اسباب تفصیل سے بیان کیے جا چکے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جب بھی ان کے سامنے ان کے پورے احترام وادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنا موقف پیش کیا جائے گا اور ان سے مستقل ومسلسل ربط وضبط قائم رکھا جائے گا تو اِن شاءاللہ العزیز اُن کی تائید اور ان کی دعائیں ضرور حاصل ہوں گی۔

حرفِ آخر

آخر میں چند معروضات پیش خدمت ہیں۔ مرکزی انجمن خدام القرآن کے زیر اہتمام پہلی قرآن کانفرنس ۱۹۷۳ء میں منعقد ہوئی تھی۔ اُس وقت میں نے کہا تھا کہ

ہمارے یہاں ''قران السعدین'' اُس ساعت اور گھڑی کو کہا جاتا ہے جب دو سعید چیزیں جمع ہو جائیں، لیکن یہاں تو بفضلہٖ ''قران السعداء'' ہو گیا ہے، اس اعتبار سے کہ اس پہلی کانفرنس میں عظیم شخصیتوں کے جانشین موجود تھے۔ وہاں ایک طرف مولانا عبدالرحمٰن اشرفی صاحب تشریف فرما تھے جو مفتی محمد حسن رحمۃ اللہ علیہ بانی جامعہ اشرفیہ کے صاحبزادے ہیں۔ دوسری طرف ہمارے سٹیج پر مولانا عبیداللہ انور صاحب تشریف فرما تھے جو مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے اور جانشین ہیں۔ پھر اس میں مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے تھے جو علمائے دارالعلوم دیوبند کی جانشینی کا اعزاز اور شرف رکھتے تھے۔ میری تو ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ جملہ مکاتب فکر کے علماء کو ایک سٹیج پر قرآن کا پیغام خلقِ خدا تک پہنچانے کے لیے جمع کیا جائے۔ چنانچہ ہماری قرآن کانفرنسوں میں جو اہم دینی و علمی شخصیتیں شریک ہوتی رہی ہیں ان میں سے چند نام پیش کرتا ہوں۔ مولانا شمس الحق افغانی، نامور عالم و محدث حضرت مولانا محمد گوندلوی، مولانا مفتی محمد حسین نعیمی، مولانا مفتی تقی عثمانی (جسٹس شریعت کورٹ)، مولانا ابوبکر غزنوی، مولانا داؤد غزنوی، پروفیسر یوسف سلیم چشتی، مولانا محمد طاسین، ڈاکٹر جسٹس تنزیل الرحمٰن (چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل) اپنے ملک کے علماء کرام و دانشوروں کے علاوہ بھارت کے کئی نامور علمائے کرام اور اہل دانش و بینش حضرات قرآن کانفرنسوں میں شرکت کر کے اپنے بیش بہا خیالات سے حاضرین کو مستفیض فرما چکے ہیں۔ مولانا حامد میاں مدظلہ خلیفۂ مجاز حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ خود تشریف نہیں لا سکے لیکن ہر کانفرنس کے لیے انہوں نے باہتمام اپنا وقیع مقالہ ارسال فرمایا۔ اس وقت جلدی میں جو نام نوکِ زبان پر آئے ان کو بیان کر دیا گیا ہے، ورنہ الحمدللہ ہر کانفرنس اس لحاظ سے بے مثال تھی کہ قرآن مجید کے پیغام کے لیے ہر مسلک کے علماء نے تعاون فرمایا۔ میرے ساتھی جانتے ہیں کہ رجم کے سلسلہ میں جن بزرگ کا ذکر ہوا ہے، اُس وقت میرا ان سے بڑے قرب کا معاملہ رہا تھا۔ تو اُس وقت انہوں نے میرے اس طرزِ عمل پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''ان مولویوں کو سر پر بٹھا کر کیا لینا ہے؟ ان

مولویوں کی تو ہمیں تردید کرنی ہے‘‘۔لیکن اللہ کا فضل یہ ہے کہ میرا مزاج یہ نہیں ہے۔ میں علماء کرام کی خدمت میں مؤدبانہ حاضر ہوا کرتا ہوں اور میں تو یہ سمجھا کرتا ہوں کہ میرے لیے تحفظ کی ایک چیز یہ ہے کہ میں عالمِ دین نہیں ہوں‘ محض قرآن مجید کا ایک طالب علم اور ادنیٰ خادم ہوں۔ ورنہ اگر کہیں مجھے بھی کوئی غرۂ علمی ہو گیا ہوتا‘ میں بھی کسی زعم میں مبتلا ہو گیا ہوتا تو اس عُجب کی وجہ سے میرے دماغ میں بھی خنّاس پیدا ہو گیا ہوتا جو میرے لیے آخرت میں ہلاکت کا سبب بن جاتا۔ میں صمیم قلب سے اللہ تعالیٰ سے کسی عُجب میں مبتلا ہونے سے پناہ کا طالب رہتا ہوں۔

’’مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق‘‘ نامی کتابچہ میں نے ۱۹۶۶ء میں لکھا تھا۔ اس کا ایک نسخہ میں نے ۱۹۷۰ء میں مولانا محمد یوسف بنوریؒ کی خدمت میں پیش کیا تھا جبکہ وہ مسجد نبویؐ میں معتکف تھے۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ اس کو بنظر غائر ملاحظہ فرما لیجیے‘ کیونکہ میں اسے بڑے پیمانے پر پھیلانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ مجھے آپ کی رہنمائی درکار ہے‘ اگر کوئی غلطی ہو تو نشان دہی فرما دیں‘ میں اس کو درست کر لوں گا۔ مولانا نے ازراہِ شفقت اور ازراہِ تعاون علی البر میری درخواست قبول فرمالی‘ اعتکاف کی حالت میں مسجد نبویؐ میں اسے پڑھا اور صرف ایک جملہ میں ترمیم فرما دی۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس ترمیم سے وہ جملہ مزید نکھر آیا‘ میرا جو مفہوم تھا وہ اس ترمیم سے مزید واضح ہو گیا اور میرے جملے سے جس مغالطے کے پیدا ہونے کا امکان تھا بحمداللہ مولانا نَوَّرَ اللّٰہُ مَرْقَدَہٗ کی ترمیم سے اس کا احتمال ختم ہو گیا۔ تو اللہ کے فضل و کرم سے میرا مزاج تو یہ ہے‘ اور آج سے نہیں ابتدا سے ہے۔ الحمدللہ میں عُجب اور تکبر سے بچنے کی شعوری طور پر اللہ تعالیٰ سے پناہ طلب کرتا رہتا ہوں۔ نبی اکرم ﷺ نے تین مہلکات میں سے اس عُجب کو شدید ترین باعثِ ہلاکت قرار دیا ہے۔ آپ سے بھی درخواست ہے کہ میرے حق میں دعا کرتے رہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے مجھے بچائے رکھے۔

کل رمضان المبارک کی ۲۹ ویں شب کو جامع القرآن‘ قرآن اکیڈمی میں ہمارا دورۂ ترجمۂ قرآن ختم ہوا ہے۔ یہ کام اللہ تعالیٰ کی توفیق و نصرت ہی سے تکمیل کو پہنچا

ہے۔اس سے مجھے ایک امید پیدا ہوئی ہے کہ یہ کام اِن شاء اللہ العزیز مقبول ہوگا اور دوسرے لوگ بھی اس کا اہتمام کریں گے۔ جیسے ہم نے ''قرآن کانفرنس'' کے سلسلہ کا آغاز کیا تو وہ اتنا عام ہوگیا کہ مختلف دینی حلقوں کی طرف سے قرآن کانفرنسوں کا سلسلہ شروع ہوگیا جو مسلسل جاری ہے۔ہمیں اس پر خوشی ہے۔ہم نے کچھ اور نئے کام شروع کیے تو اس نہج پر بھی کام شروع ہوگیا۔اللہ سب کو توفیق دے اور سب کے کاموں میں برکت دے' ان کو دین کے لیے سازگار بنائے' ایک کام کے لیے بیسیوں ادارے ہوں' سینکڑوں اشخاص ہوں' لیکن آپس میں ٹکراؤ اور تصادم نہ ہو تو یہ بڑی نیک فال ہے۔ میری معلومات کی حد تک رمضان المبارک میں تراویح کے ساتھ دورۂ ترجمۂ قرآن پہلی مرتبہ پایۂ تکمیل تک پہنچا ہے۔ ہمارے یہاں تراویح تو ہر مسجد میں ہوتی ہے اور جن لوگوں کو توفیق ملتی ہے اور جن میں ذوق وشوق ہے وہ تراویح پڑھتے ہیں۔اگر ہر چار رکعات تراویح سے قبل ان میں پڑھے جانے والے قرآن مجید کا حاضرین کو صرف ترجمہ سنا دیا جائے تو میرا اندازہ ہے کہ شرکاء چاہے عربی سے بالکل ہی ناواقف ہوں پڑھے جانے والے قرآن مجید کے کم از کم پچیس فیصد حصے کے مفہوم کو سمجھتے چلے جائیں گے۔اس لیے کہ ترجمہ کے ذریعے قرآنی الفاظ کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی قائم ہو جاتی ہے اور یہ ذہنی رابطہ معنی اور مفہوم کو سمجھنے میں مدد ہوتا ہے۔اگر اللہ تعالیٰ توفیق دے اور بڑی بڑی مساجد میں بڑے پیمانے پر ہمارے علماء کرام اس کام کی طرف توجہ دیں تو میرے نزدیک یہ بہت بڑا break through ہو جائے گا۔

ہمارے بعض احباب نے کل ختم قرآن کے موقع پر اپنے تأثرات کا اظہار فرمایا کہ یہ کام جتنا کٹھن نظر آ رہا تھا' اتنا کٹھن ثابت نہیں ہوا۔سینکڑوں کی تعداد میں جن لوگوں نے شرکت کی ہے' ان میں اکثر وہ حضرات بھی تھے جو رات دو بجے تک اس پروگرام میں شریک رہے اور دن کو انہوں نے اپنے معمولات کے مطابق کام بھی پورے کیے۔اور الحمد للہ یہ نہیں ہوا کہ شروع شروع میں لوگ آ گئے ہوں' پھر جوش ٹھنڈا پڑ گیا ہو' بلکہ مسلسل حاضری بڑھتی چلی گئی۔اللہ کرے ہمارے واجب الاحترام رجالِ

دین کی توجہ اس طرف مبذول ہو جائے اور وہ اس کام کو شروع فرما دیں تو میرے نزدیک یہ بہت مفید کام ہوگا' خاص طور پر جاہلیت قدیمہ کے تمام مشرکانہ اوہام کی جڑیں کاٹ دے گا' شفاعتِ باطلہ کے جو عقائد ذہنوں میں بیٹھے ہوئے ہیں ان کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکے گا' اوہام کا طومار اِن شاء اللہ تراویح کے ساتھ لفظی ترجمہ کے ذریعہ چھٹتا چلا جائے گا اور توحید خالص نکھر کر اذہان میں جاگزیں ہوتی جائے گی۔

میں اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کرتا ہوں' آپ بھی دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے جو بھی اب تک خیر کی توفیق بخشی ہے وہ اسے شرفِ قبولیت بھی عطا فرمائے اور دوسرے لوگوں کو بھی ہمت دے کہ وہ میرے ساتھ جڑ کر اور میرے دست و بازو بن کر یہ کام کریں اور اس کے لیے ان کے دلوں کو انشراح عطا فرمائے۔ یہ نہیں تو ان کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ صحیح نہج پر دین کا کام کریں۔ یہ صرف میرا کام نہیں ہے' یہ ہر مسلمان کا دینی فریضہ ہے کہ اللہ کے دین کی سربلندی اور سرفرازی کے لیے اپنا تن' من' دھن لگائے۔ اللہ تعالیٰ ایسے تمام لوگوں کی مساعی کو مشکور فرمائے۔ اگر ہمارے دلوں میں خلوص ہوا تو آج نہیں تو کل ہم جمع ہو جائیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ مجھے کسی کے بارے میں اس وقت کوئی اندیشہ ہو' کسی کو میرے بارے میں خدشات ہوں' تو اپنی اپنی جگہ خلوص و اخلاص اور خشیتِ الٰہی کے ساتھ کام کریں گے تو ہم یہاں جمع نہ بھی ہو سکے تو دین کی جو بھی صحیح خدمت ہوگی اس کے اثرات اِن شاء اللہ مستقبل میں ایک جگہ جمع ہو جائیں گے——— اور آخرت میں تو ہم سب کو بالآخر جمع ہونا ہی ہے: ﴿اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿١٥﴾﴾ (الشوریٰ)

اقول قولی هذا واستغفر اللّٰه لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات○○

حواشی وحوالہ جات (اضافہ از مرتبین)

(۱) محترم ڈاکٹر صاحب کے یہ دونوں خطابات ''جہاد بالقرآن اور اُس کے پانچ محاذ'' کے عنوان سے کتابی صورت میں موجود ہیں۔

(۲) محترم ڈاکٹر صاحب کی مشہور تالیف ''علامہ اقبال اور ہم'' میں ایک مستقل باب ''اقبال اور

قرآن'' کے عنوان سے شامل ہے جس میں علامہ نے قرآن حکیم کے بارے میں جن جذبات و احساسات کا اظہار کیا ہے اس سے متعلق اکثر اردو اور فارسی کے اشعار شامل ہیں۔

(۳) یہ بیان ''تحریک جماعت اسلامی۔ایک تحقیقی مطالعہ'' کے نام سے مطبوعہ موجود ہے۔

(٤) رواه البيهقي في شعب الايمان۔ بحواله مشكوٰة المصابيح' كتاب العلم' الفصل الثالث۔

(٥) صحيح مسلم' كتاب الامارة' باب قوله لا تزال طائفة من امتي ظاهرين على الحق.....

(٦) دوسرا مصرعہ دراصل شیخ سعدیؒ کا ہے۔

(۷) یہ بزرگ مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم تھے۔افسوس کہ وہ آخر دم تک اسی موقف پر جازم رہے اور اس سے رجوع نہیں کیا۔

(۸) اہل سنت کے تمام مکاتب فکر کے نزدیک جن چھ کتب احادیث کو صحاحِ ستہ کہا جاتا ہے ان میں مسلم شریف کا شمار دوسرے نمبر پر ہوتا ہے۔حضرت ماعز بن مالک اسلمی رضی اللہ عنہ کے متعلق رجم کے بعد نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد مروی ہے: **لَقَدْ تَابَ تَوْبَةً لَوْ قُسِمَتْ بَيْنَ أُمَّةٍ لَوَسِعَتْهُمْ** مصنف عبدالرزاق میں حضرت ماعز اسلمیؓ کے بارے میں حضور ﷺ کے یہ الفاظ بھی آئے ہیں: **اِنَّـه الْآنَ لَفِيْ اَنْهَارِ الْجَنَّةِ يَنْغَمِسُ**۔

(۹) ان بزرگ کی تحقیق کا تجزیہ کیجیے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ معاذ اللہ نبی اکرم ﷺ نے موجودہ دور کے تھانہ داروں کی طرح third degree method استعمال کر کے ان صحابی کو اقرارِ جرم پر مجبور کر دیا تھا۔ حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ اس طور پر حاصل شدہ اقرار جرم کی قانوناً کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔اس طرح واضح ثبوت کے بغیر محض ''تیکھے انداز سے پوچھ گچھ'' کے نتیجہ میں مجبور کر کے اقرارِ جرم کرانے کا الزام معاذ اللہ اس ہستی ﷺ پر عائد ہوتا ہے جو نظامِ عدل وقسط قائم کرنے کے لیے مبعوث ہوئی تھی: ﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ﴾۔مزید برآں ایک نہایت قابل غور بات یہ ہے کہ ان محقق ومفسر قرآن نے متعدد مرتبہ لکھا ہے کہ ''روایات سے معلوم ہوتا ہے'' لیکن کسی ایک روایت کا بھی حوالہ نہیں دیا' جبکہ تحقیق کا حق اور انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ ایک صحابی پر جب زبانِ طعن کھولی ہے تو اُن روایات کا حوالہ بھی دیا جاتا تاکہ تحقیق کی جا سکتی کہ ان روایات کا کیا مقام ہے! اکثر معتبر کتب احادیث میں جو روایات ملتی ہیں ان سب کا حاصل یہ ہے کہ حضرت ماعز رضی اللہ عنہ نے بغیر کسی جبر واکراہ کے ازخود اعتراف واقرارِ جرم کیا تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے ان کو ٹالنا چاہا لیکن وہ مصر رہے کہ ان کو پاک کر دیا جائے۔ حضور ﷺ نے تحقیق فرمائی کہ یہ نشہ تو نہیں کرتے؟ ان پر دیوانگی کا تو دَورہ نہیں پڑتا؟ جب ایسی کوئی بات نہیں نکلی کہ ''شک'' کا فائدہ ان صحابی کو پہنچ سکتا تو آپؐ نے ان کے اصرار پر

رجم کی حد جاری کرنے کا حکم صادر فرمایا۔

(۱۰) صحیح مسلم ہی میں غامدیہ خاتونؓ کے بارے میں آنحضورﷺ کا یہ ارشاد مروی ہے:

((فَوَ الَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَقَدْ تَابَتْ تَوْبَۃً لَوْ تَابَھَا صَاحِبُ مَکْسٍ لَغُفِرَلَہٗ))

(۱۱) واضح رہے کہ محترم ڈاکٹر صاحب کا یہ خطاب ۱۹۸۴ء کا ہے اور جس فتنہ پرور نوجوان کا ڈاکٹر صاحب نے ذکر کیا ہے یہ علامہ جاوید احمد غامدی ہیں، جو اَب اسلام کا ایک جدید روشن خیال، اعتدال پسند ایڈیشن پیش کر چکے ہیں۔

(۱۲) صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب فضائل اصحاب النبی ﷺ۔ وصحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب فضل الصحابة ثم الذین یلونھم.....

(۱۳) صحیح البخاری، کتاب الاذان، باب الاذان للمسافر.....

(۱٤) سنن الترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ما جاء فی فضل القرآن۔

نبی کریم ﷺ اور شعر وشاعری

عتیق الرحمٰن صدیقی

مشرکین مکہ حضور نبی کریم ﷺ کو شاعر اور قرآن کریم کو شعر کہتے تھے۔ اس حوالے سے قرآن حکیم کے درج ذیل مقامات قابل توجہ ہیں:

☆ ﴿بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ﴾ (الانبیاء:۵)

''وہ کہتے ہیں: بلکہ یہ پراگندہ خواب ہیں' بلکہ یہ اس (محمد ﷺ) کی من گھڑت ہے' بلکہ یہ شخص شاعر ہے''۔

☆ ﴿وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ۝ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۝ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ۝﴾ (الشُّعراء)

''رہے شعراء تو ان کے پیچھے بہکے ہوئے لوگ چلا کرتے ہیں۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے ہیں اور ایسی باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں؟''

☆ ﴿وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ﴾ (یٰس:٦٩)

''اور ہم نے اس (نبی) کو شعر نہیں سکھایا ہے اور نہ شاعری اس کو زیب دیتی ہے''۔

☆ ﴿وَيَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ ۝﴾ (الصّٰفّٰت)

''اور کہتے تھے: کیا ہم ایک شاعر مجنون کی خاطر اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں؟''

☆ ﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ﴾ (الطور)

''کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ شخص شاعر ہے جس کے حق میں ہم گردشِ ایام کا انتظار کر رہے ہیں؟''

☆ ﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۭ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ۝﴾ (الحاقّة)

''یہ تو ایک رسولِ کریم کا قول ہے' کسی شاعر کا قول نہیں ہے' تم لوگ کم ہی ایمان لاتے ہو''۔

قرآن نے کفارِ مکہ کے اس الزام کی تردید کی اور کہا کہ نبی اکرم ﷺ جو کلام پیش کر رہے ہیں اسے شعراء سے کوئی نسبت نہیں۔ آپؐ کو شاعر' کاہن اور مجنون کہنے والے شیاطین کے پیروکار ہیں' وہ آپؐ سے اس قسم کی باتیں منسوب کر کے لوگوں کو حق سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔

شعر کے معروف معنی تو یہ ہیں کہ ایسا کلام جس کا وزن بھی ہو اور قافیہ بھی' اور شاعر کہتے ہیں اس شخص کو جو ارادتاً مقفّٰی کلام کہے۔ ان معنوں میں نہ تو قرآن کو شعر کہا جا سکتا ہے اور نہ رسول اکرم ﷺ کو شاعر۔ اہل عرب جو دقائق لغت سے شناسا تھے وہ کیونکر آنحضرت ﷺ پر شعر بمعنی منظوم و مقفّٰی کلام کی تہمت لگا سکتے تھے! وہ تو ہر ایسی آیت کی تأویل کرنے لگ جاتے تھے جس میں وزن پایا جاتا تھا۔ علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں :

> ''اس سے ان کا مقصد منظوم اور مقفّٰی کلام بنانے کی تہمت لگانا نہیں تھا' کیونکہ ظاہر ہے کہ قرآن اسلوب شاعری سے مبرا ہے اور اس حقیقت کو عجمی عوام بھی سمجھ سکتے ہیں۔ پھر فصحاء عرب کا کیا ذکر ہے؟ بلکہ وہ آپؐ پر (نعوذ باللہ) جھوٹ کی تہمت لگاتے تھے' کیونکہ عربی زبان میں شعر بمعنی کذب اور شاعر بمعنی کاذب استعمال ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ جھوٹے دلائل کو اَدِلَّـةٌ شِعرِيَّةٌ کہا جاتا ہے۔ اسی لیے قرآن نے شعراء کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿۲۲۴﴾﴾ (الشعراء) ''اور شاعروں کی پیروی گمراہ لوگ کیا کرتے ہیں۔'' اور شعر چونکہ جھوٹ کا پلندہ ہوتا ہے اس لیے مقولہ مشہور ہے: احسن الشعر اَكذَبُهٗ ''سب سے بہتر شعر وہ ہے جو سب سے زیادہ جھوٹ پر مشتمل ہو''۔ اور کسی حکیم نے کہا ہے کہ ''میں نے کوئی متدیّن اور راست گو انسان نہیں دیکھا جو شعر گوئی میں ماہر ہو''۔ (مفردات القرآن' جلد اوّل)

حضور نبی کریم ﷺ اخلاق کے بلند مرتبے پر فائز تھے۔ ذہن' مزاج' طبیعت' طور اطوار' عادات اور گفتگو میں غایت درجہ متوازن تھے' ہدایت خلق کے کام میں اذیتیں برداشت کیے جا رہے تھے' ان کی منزل متعین تھی اور ہدف بھی واضح تھا اور جو کلام پیش کر رہے تھے اس میں بلا کی جاذبیت اور مقناطیسیت تھی اور ایسی کشش جو دلوں کو کھینچتی تھی اور کوئی زبان دان اسے سن کر سر دھنے بغیر نہیں رہ سکتا تھا' جو دل کے ٹوٹے ہوئے تاروں کو جوڑتی تھی اور روح کو سرشار کر کے رکھ دیتی تھی۔ اس معجز نما کلام کی اثر آفرینی پر مشرکین متحیر ہو جاتے تھے اور سوچتے تھے کہ اس کا توڑ کیسے کیا جائے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ محمد کریم ﷺ کا مقابلہ کرنے کے لیے کون سا ہتھیار استعمال کیا جائے۔ وہ کبھی کاہن کی تہمت تراشتے' کبھی دیوانہ کہتے اور گاہے حضور ﷺ کو

شاعر قرار دیتے۔ ایک موقع پر سردارانِ قریش سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور مسلسل سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ آپؐ کو لالچ کے دام میں پھانسا جائے اور دولت‘ عزت اور عورت کا جھانسا دے کر ان کی راہ روکی جائے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے عتبہ ایسے ذہین وطباع‘ چرب زبان اور فصیح اللسان آدمی کا انتخاب کیا۔ وہ حضورﷺ کے پاس گیا اور اپنی فصاحت لسانی کا مظاہرہ کیا۔ آپؐ نے نہایت تحمل سے اس کی گفتگو کو سنا اور پھر جواب میں اسے حٰم السجدۃ کی آیات سنائیں۔ وہ سن کر متعجب ہوا‘ اس کا رنگ فق ہوگیا‘ واپس ہوا تو چہرہ بدلا ہوا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا: ’’بخدا میں نے ایسا کلام سنا کہ کبھی اس سے پہلے نہ سنا تھا‘ خدا کی قسم نہ یہ شعر ہے‘ نہ سحر ہے اور نہ کہانت۔ اے سردارانِ قریش! میری بات مانو اور اس شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دو‘ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کلام رنگ لا کر رہے گا!‘‘

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شجاعت‘ زور آوری‘ تیر اندازی اور بہادری کے ڈنکے پورے مکہ میں بجتے تھے‘ مضبوط جسم و جان کے مالک تھے۔ قبول اسلام سے پہلے وہ اسلام کے بہت بڑے دشمن متصور ہوتے تھے۔ ایک رات وہ رسول اللہﷺ کو ستانے کی غرض سے نکلے۔ یہ ایسا وقت تھا کہ آپﷺ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے‘ سورۃ الحاقۃ کی آیات آپؐ کی زبان مبارک پر رواں تھیں۔ کان میں قرآن کی آیتیں پڑیں تو کچھ رک سے گئے‘ قرآن کے نظم واسلوب سے اتنے متأثر ہوئے کہ ستانے اور چھیڑنے کے بجائے سوچ میں پڑ گئے اور دل میں کہنے لگے کہ خدا کی قسم یہ شاعر ہے‘ جیسا کہ قریش کہتے ہیں۔ ابھی یہ خیال آیا ہی تھا کہ آپؐ نے یہ آیت پڑھی:

﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۭ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ۝﴾ (الحاقّة)

’’یہ ایک بزرگ قاصد کا کلام ہے‘ اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں‘ تم سب کم ایمان رکھتے ہو‘‘۔

اور پھر وہ مرحلہ بھی آتا ہے کہ اپنی بہن فاطمہ اور بہنوئی سعید کے اسلام لانے کی خبر سنتے ہیں‘ یہ خبر اُن پر بجلی بن کر گرتی ہے‘ بہن کے گھر پہنچ کر ان دونوں کو اتنا مارتے ہیں کہ لہولہان کر دیتے ہیں۔ غصہ فرو ہونے پر ندامت محسوس کرتے ہیں اور قرآن سننے کا مطالبہ کرتے ہیں اور جب سورۂ طٰہٰ کی آیات سنتے ہیں تو موم ہوجاتے ہیں‘ ساری شقاوت و کثافت دھل جاتی ہے اور آستانۂ نبوت پر پہنچ کر حلقہ بگوش اسلام ہو جاتے ہیں۔ یہ قرآن کی کشش تھی اور صاحبِ قرآنﷺ کا دلکش انداز تھا جو سامع کو گھائل کر کے رکھ دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کفار لوگوں سے

کہتے تھے کہ جب محمد (ﷺ) قرآن سنائیں تو خوب شور مچایا کرو، تالی پیٹا کرو۔ قرآن حکیم میں آیا ہے:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ﴿٢٦﴾﴾ (حٰمٓ السجدة)

''یہ منکرین کہتے ہیں کہ اس کلام کو ہرگز نہ سنو اور (سنایا جائے تو) اس میں خلل ڈالو، شاید کہ تم اس طرح غالب آ جاؤ۔''

کلام اللہ کی تأثیر کو خود قرآن نے ایک تمثیل میں بیان فرمایا:

﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿٢١﴾﴾ (الحشر)

''اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اتارتے تو اسے تو ضرور دیکھتا جھکا ہوا اور پاش پاش ہوتا اللہ کے خوف سے۔ اور یہ مثالیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں کہ وہ سوچیں۔''

طفیل بن عمرو دوسی قبیلۂ دوس کا ایک شاعر تھا، کسی کام سے مکہ گیا، قریش کے لوگوں نے اس کے خوب کان بھرے، یہاں تک کہ وہ اللہ کے رسول ﷺ سے سخت بدگمان ہو گیا اور اس نے یہ طے کر لیا کہ وہ آپؐ سے بچ کر رہے گا۔ وہ جب حرم میں حاضری کے لیے گیا تو حضور ﷺ کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے، اس کے کانوں میں قرآن کے چند جملے پڑے تو اس نے محسوس کیا کہ یہ تو کوئی بڑا اچھا کلام ہے۔ اس نے دل میں کہا کہ وہ خود شاعر ہے، عاقل بالغ ہے، صحیح وغلط میں تمیز کر سکتا ہے، آخر کیوں نہ اس شخص سے معلوم کرے کہ وہ کیا کہتا ہے۔ وہ بعد میں آپؐ سے ملا اور آپؐ کے پیغام کی تفصیل طلب کی، حضور ﷺ نے اسے قرآن حکیم کا ایک حصہ پڑھ کر سنایا اور وہ اتنا متأثر ہوا کہ اسی وقت ایمان لے آیا اور پھر واپس جا کر اس نے اپنے باپ اور بیوی کو مسلمان کیا اور پھر مسلسل اشاعتِ اسلام میں مصروف ہو گیا۔

سردارانِ قریش کی ایک محفل میں نضر بن حارث نے تقریر کی کہ:

''تم لوگ محمد (ﷺ) کا مقابلہ جس طرح کر رہے ہو اس سے کام نہ چلے گا۔ وہ جب تم میں نوعمر جوان تھا تو تمہارا سب سے زیادہ خوش اطوار آدمی تھا، سب سے زیادہ سچا اور سب سے بڑھ کر امین سمجھا جاتا تھا۔ اب اس کے بال سفید ہونے کو آ گئے ہیں، تم کہتے ہو یہ ساحر ہے، کاہن ہے، شاعر ہے، مجنون ہے۔ بخدا وہ ساحر نہیں ہے، ہم نے

ساحروں کو دیکھا ہے اوران کی جھاڑ پھونک سے واقف ہیں۔ بخدا وہ کاہن بھی نہیں ہے' ہم نے کاہنوں کی تک بندیاں سنی ہیں اور جیسی گول مول باتیں وہ کیا کرتے ہیں ان کا ہمیں علم ہے۔ بخدا وہ شاعر بھی نہیں ہے' شعر کی تمام اصناف سے ہم واقف ہیں اوراس کا کلام ان میں سے کسی صنف میں نہیں آتا''.....اس نے یہ تجویز پیش کی کہ عجم سے رستم و اسفندیار کے قصے لا کر پھیلائے جائیں تاکہ لوگ ان میں دلچسپی لینے لگیں''۔(ابن ہشام' جلداوّل' بحوالہ تفہیم القرآن' جلدسوم)۔

﴿وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ﴿۲۲۴﴾﴾ (الشُّعراء۔) ''رہے شعراء تو ان کے پیچھے بہکے ہوئے لوگ چلا کرتے ہیں''۔کی وضاحت میں سید مودودیؒ رقم طراز ہیں:

''یعنی شاعروں کے ساتھ لگے رہنے والے لوگ اپنے اخلاق' عادات وخصائل اور افتادِ مزاج میں ان لوگوں سے بالکل مختلف ہوتے ہیں جو محمدؐ کے ساتھ تمہیں نظر آتے ہیں۔ دونوں گروہوں کا فرق ایسا کھلا ہوا فرق ہے کہ ایک نظر دیکھ کر ہی آدمی جان سکتا ہے کہ یہ کیسے لوگ ہیں اور وہ کیسے.....ان لوگوں کو دیکھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سامنے ایک بلند اور پاکیزہ نصب العین ہے جس کی دھن میں یہ رات دن لگے ہوئے ہیں اوران کی زندگی ایک مقصدِ عظیم کے لیے وقف ہے۔ دوسری طرف حال یہ ہے کہ کہیں عشق بازی اور شراب نوشی کے مضامین بیان ہو رہے ہیں اور حاضرین اُچھل اُچھل کر ان پر داد دے رہے ہیں' کہیں کسی زن بازاری یا کسی گھر کی بہو بیٹی کا حسن موضوعِ سخن ہے.....کہیں کسی کی بے جا تعریف ہو رہی ہے اوراس پر تحسین و آفرین کے ڈونگرے برسائے جا رہے ہیں اور کہیں کسی کے خلاف نفرت' عداوت اور انتقام کے جذبات بھڑکائے جا رہے ہیں.....ان دونوں گروہوں کا کھلم کھلا فرق وامتیاز اگر کسی کو نظر نہیں آتا تو وہ اندھا ہے اوراب سب کچھ دیکھ کر بھی کوئی محض حق کو نیچا دکھانے کے لیے ایمان نگل کر یہ کہتا ہے کہ محمدؐ اوران کے گرد جمع ہونے والے اسی قبیل کے لوگ ہیں جیسے شعراء اوران کے پیچھے لگے رہنے والے لوگ ہوتے ہیں' تو وہ جھوٹ بولنے میں بے حیائی کی ساری حدیں پار کر گیا ہے''۔(تفہیم القرآن)

شعراء کا توسنِ فکر بے لگام گھوڑے کی طرح ہر وادی میں بھٹکتا پھرتا ہے' وہ کبھی حکمت و موعظت کی باتیں کرتے ہیں اور کبھی گندے سفلی جذبات بھڑکاتے ہیں' کسی سے خوش ہوتے ہیں تو اسے آسمان پر چڑھاتے ہیں اور کسی سے بگڑ جائیں تو اسے تحت الثریٰ میں جا گراتے

ہیں۔ چنانچہ صاحب تفہیم لکھتے ہیں:

''خدا پرستی اور دہریت، مادہ پرستی اور روحانیت، حسن اخلاق اور بداخلاقی، پاکیزگی اور گندگی، سنجیدگی اور ہزل، قصیدہ اور ہجو سب کچھ ایک ہی شاعر کے کلام میں آپ کو پہلو بہ پہلو مل جائے گا.....

قرآن مجید میں ایک دوسرے مقام پر نبی اکرم ﷺ کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ آپؐ کے مزاج کو تو شاعری کے ساتھ سرے سے کوئی مناسبت ہی نہیں ہے: ﴿وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ﴾ (یٰس:٦٩) ''ہم نے اس (محمد ﷺ) کو شعر نہیں سکھایا ہے نہ یہ اس کے کرنے کا کام ہے''۔ اور یہ ایک ایسی حقیقت تھی کہ جو لوگ بھی نبی ﷺ سے ذاتی واقفیت رکھتے تھے وہ سب اسے جانتے تھے۔ معتبر روایات میں آیا ہے کہ کوئی شعر حضور ﷺ کو پورا یاد نہ تھا، دورانِ گفتگو میں کبھی کسی شاعر کا کوئی اچھا سا شعر زبان مبارک پر آتا بھی تو غیر موزوں پڑھ جاتے تھے یا اس میں الفاظ کا الٹ پھیر ہو جاتا تھا۔ حضرت حسن بصری کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ دوران تقریر میں آپؐ نے شاعر کا مصرعہ یوں نقل کیا:

كفى بالاسلام والشيب للمرء ناهيا

حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! اصل مصرعہ یوں ہے:

كفى الشيب والاسلام للمرء ناهيا

حضرت عائشہؓ سے پوچھا گیا کہ حضور ﷺ کبھی اشعار بھی اپنی تقریروں میں استعمال فرماتے تھے؟ انہوں نے فرمایا: شعر سے بڑھ کر آپؐ کو کسی چیز سے نفرت نہ تھی، البتہ کبھی کبھار بنی قیس کے شاعر کا ایک شعر پڑھتے تھے مگر اوّل کو آخر اور آخر کو اوّل پڑھ جاتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ عرض کرتے یا رسول اللہ یوں نہیں بلکہ یوں ہے، تو آپؐ فرماتے: ''بھائی میں شاعر نہیں ہوں اور نہ شعر گوئی میرے کرنے کا کام ہے''۔ جس قسم کے مضامین سے عرب کی شاعری لبریز تھی وہ یا تو شہوانیت اور عشق بازی کے مضامین تھے یا شراب نوشی کے، یا قبائلی منافرت اور جنگ و جدل کے یا نسلی فخر و غرور کے۔ نیکی اور بھلائی کی باتیں ان میں بہت ہی کم پائی جاتی تھیں۔ پھر جھوٹ، مبالغہ، بہتان، ہجو، بیجا تعریف، ڈینگیں، طعن، پھبتیاں اور مشرکانہ خرافات تو اس شاعری کی رگ رگ میں پیوست تھیں، اس لیے نبی مکرم ﷺ کی رائے اس شاعری کے متعلق یہ تھی کہ: ((لَاَنْ

یَمْتَلِئَ جَوْفُ اَحَدِکُمْ قَیْحًا خَیْرٌ لَـہٗ مِنْ اَنْ یَمْتَلِئَ شِعْرًا))(متفق علیہ) ''تم میں سے کسی شخص کا خول پیپ سے بھر جانا اس سے زیادہ بہتر ہے کہ وہ شعر سے بھرے''۔تاہم جس شعر میں کوئی اچھی بات ہوتی تھی آپؐ اس کی داد بھی دیتے تھے اور آپؐ کا ارشاد تھا کہ: ((اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِکْمَۃً)(صحیح البخاری) ''یقیناً بعض اشعار حکیمانہ ہوتے ہیں''۔اُمیہ بن ابی الصَّلْت کا کلام سن کر آپؐ نے فرمایا: ((آمَنَ شِعْرُہٗ وَکَفَرَ قَلْبُہٗ))(البدایۃ والنہایۃ) ''اس کا شعر مؤمن ہے مگر اس کا دل کافر ہے''۔ایک مرتبہ ایک صحابیؓ نے سو کے قریب عمدہ عمدہ اشعار آپؐ کو سنائے اور آپؐ فرماتے گئے: ھِیہ ''اور سناؤ''۔(صحیح مسلم) (تفہیم القرآن' جلد سوم)

شعراء کی بالعموم یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ جو وہ کہتے ہیں کرتے نہیں۔قرآن یہ کہتا ہے کہ: ﴿لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝﴾(الصّف) ''تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟'' حضور نبی کریم ﷺ کا عمل یہ تھا کہ آپ کے قول و فعل میں مکمل یکسانیت تھی اور یہ ایک ایسی صریح اور بدیہی حقیقت ہے کہ جس سے آپؐ کے گرد و پیش میں کوئی انکار نہیں کر سکتا تھا۔شعراء جو مضمون زور و شور سے باندھتے ہیں خود اُس سے خالی ہوتے ہیں' دوسروں کی ادنیٰ کمزوریوں پر بھی گرفت کرتے ہیں اور خود بدترین کمزوریوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔قرآن نے ان کے اس پہلو کو اجاگر کیا ہے اور پُرزور الفاظ میں اُن کے اس طرزِ عمل کی مذمت کی ہے۔حضور نبی کریم ﷺ نے بھی اسی تناظر میں ان پر نفرین بھیجی ہے۔

سورۃ الشعراء کی تین آیتیں (۲۲۴ تا ۲۲۶) نازل ہوئیں تو حضراتِ حسان بن ثابت' عبداللہ بن رواحہ' کعب بن مالک اور کعب بن زہیر رضی اللہ عنہم روتے ہوئے حضور ﷺ کے پاس آئے اور کہا کہ یارسول اللہ! شاعروں کے حق میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل کی ہیں' ہم شاعر ہیں' ہم تو ہلاک ہو گئے' ہماری نجات کی کوئی صورت نہیں۔چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اُتاری:

﴿اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَکَرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ؕ﴾ (الشعراء:۲۲۷)

''بجز اُن شعراء کے جو ایمان لے آئے اور انہوں نے نیک عمل کیے اور کثرت سے اللہ کو یاد کرتے ہیں اور انتقام لیتے ہیں اس کے بعد کہ ان پر ظلم کیا گیا''۔

گویا ان شعراء کو مستثنیٰ کیا گیا ہے جو چار خصوصیات کے حامل ہیں: اوّلاً یہ کہ وہ مؤمن ہوں' اللہ

اس کے رسولؐ ' اس کی کتابوں اور آخرت کو مانتے ہوں۔ ثانیاً صالح ہوں' فاسق و فاجر نہ ہوں۔ ثالثاً اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے ہوں اور رابعاً وہ شخصی اغراض کے لیے نہ تو کسی کی ہجو کرنے والے ہوں اور نہ ذاتی و نسلی عصبیتوں کی خاطر انتقام کی آگ بھڑکانے والے ہوں۔ مذکورہ صفات کے حامل شعراء اللہ کے ہاں محبوب اور پسندیدہ ہیں۔ صحابہ کرامؓ میں بڑے بڑے جلیل القدر شعراء موجود تھے۔ حضرت حسان بن ثابتؓ کے لیے مسجد نبویؐ میں منبر رکھا جاتا اور وہ کافر شعراء کا جواب دیتے۔ ایک دن ابوسفیان کی (قبل از اسلام) ہرزہ سرائی کے جواب میں حضرت حسان نے فرمایا:

هَجَوْتَ مُحَمَّدًا فَاَجَبْتُ عَنْهُ وَعِنْدَ اللّٰهِ فِی ذَاکَ الْجَزَاءُ
وَاِنَّ اَبِیْ وَوَالِدَتِیْ وَعِرْضِیْ لِعِرْضِ مُحَمَّدٍ مِّنْکُمْ وِقَاءُ
اَتَشْتِمُهٗ وَلَسْتَ لَهٗ بِکُفْءٍ فَشَرُّکُمَا لِخَیْرِکُمَا الْفِدَاءُ
لِسَانِیْ صَارِمٌ لَا عَیْبَ فِیْهِ وَبَحْرِیْ لَا تُکَدِّرُهُ الدِّلَاءُ

ترجمہ: ☆ (اے ابوسفیان!) تو نے محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں نازیبا باتیں کیں اور میں اس ہجو کا تمہیں جواب دے رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جناب میں مجھے اس کی جزائے خیر ملے گی۔

☆ سنو! تمہاری بدزبانی سے حضور کی عزت کو بچانے کے لیے میرا باپ' میری ماں اور میری بیوی بطور سپر کام دیں گے۔ یعنی میں اپنے باپ' اپنی ماں اور اپنی بیوی تک کو حضور ﷺ کی عزت پر قربان کر دوں گا۔

☆ کیا تو اس کی جناب میں نازیبا بات کہتا ہے جس کا تو ہم پایہ نہیں ہے؟ تم دونوں میں سے جو برا ہے وہ اس پر فدا ہو جو تم میں سے اچھا ہے۔

☆ میری زبان تیز تلوار ہے' اس میں کوئی نقص نہیں ہے' اور میرا بحر فصاحت اتنا گہرا ہے کہ ڈول نکالنے سے وہ مکدر نہیں ہوتا۔

حضور نبی کریم ﷺ دوسرے شعرائے اسلام کی ہمت افزائی بھی فرماتے تھے۔ چنانچہ کعب بن مالکؓ سے آپؐ نے فرمایا: ((اَهْجِهِمْ ' فَوَ الَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَهُوَ اَشَدُّ عَلَیْهِمْ مِنَ النَّبْلِ)) ''ان کی ہجو کہو' کیوں کہ اس خدا کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے! تمہارا شعر ان کے حق میں تیر سے زیادہ تیز ہے''۔ جناب حسانؓ سے ایک موقع پر فرمایا: ((اَهْجِهِمْ

وَجِبْرِیْلُ مَعَکَ)) ''ان کی خبر لو اور جبریلؑ تمہارے ساتھ ہیں''۔ مزید فرمایا: ((قُلْ رُوْحُ الْقُدُسِ مَعَکَ)) ''ان کی ہجو میں شعر کہو روح القدس تمہارے ساتھ ہیں''۔ آپؐ کا ارشاد تھا کہ ''مؤمن تلوار سے بھی لڑتا ہے اور زبان سے بھی''۔ گویا بلند پایہ مضامین پر مشتمل ایسے اشعار جو تصورِ توحید کو نمایاں کرتے ہوں' عقیدۂ رسالت کی تصریح کرتے ہوں' اسلام کی حقانیت پر دلالت کرتے ہوں' جہاد کی ترغیب دیتے ہوں' سامع کو فضائل اخلاق سے متصف کرتے ہوں وہ مرغوب اور محمود ہیں اور جو اس کے برعکس جھوٹ اور فحاشی پر مبنی ہوں اور سفلی جذبات کو اُبھارتے ہوں وہ مذموم اور نامحمود ہیں۔ ابویعلیٰ نے ابن عمرؓ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ ''شعر ایک کلام ہے' اگر اس کا مضمون اچھا اور مفید ہے تو شعر اچھا ہے اور مضمون برا یا گناہ کا ہے تو شعر برا ہے''۔ (فتح الباری)

اخذ واستفادہ

(۱) ابن کثیر (۲) مفردات القرآن' حصہ اول
(۳) تفہیم القرآن' جلد سوم تا ششم (۴) ضیاء القرآن' جلد چہارم
(۵) معارف القرآن' جلد ششم (۶) سیارہ ڈائجسٹ' قرآن نمبر

شاتمِ اُمہات المؤمنینؓ
اسلام کی نظر میں

ابن عبدالحق الہندی

عمومی طور پر تو ازواجِ سید المرسلینؐ اُمہات المؤمنین رضی اللہ عنہن صحابہ کرام اور صحابیات رضی اللہ عنہم میں شامل ہیں' کیونکہ وہ انہی میں سے ہیں۔ لہٰذا جن قرآنی آیات اور احادیث رسولؐ میں حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو برا بھلا کہنے کی حرمت ذکر ہوئی ہے' امہات المؤمنین بھی اس میں داخل ہیں۔ لیکن ان پاکیزہ ہستیوں کو چونکہ سرورِ عالم حضور نبی کریم ﷺ سے گہری قرابت اور عظیم منزلت حاصل ہے' اس لیے اہل علم نے انہیں گالی دینے اور برا بھلا کہنے والے سے متعلق شریعت کے حکم اور اس کی سزا بیان کرنے میں کسی قسم کی غفلت کا مظاہرہ نہیں کیا' بلکہ اپنی تألیفات وتصنیفات اور اقوال وارشادات کے ذریعے اس معاملے کی خوب وضاحت فرمائی ہے' جسے سطورِ ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔

☆ تمام علماء کا اس امر پر کامل اتفاق ہے کہ جو شخص اُمّ المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو منافقین کے لگائے گئے جھوٹے اور بے بنیاد الزام کی بنا پر مطعون ٹھہراتا ہے اور صدیقۂ کائنات کی گستاخی کا مرتکب ہوتا ہے وہ کافر ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے تو انہیں اس سے بری فرما دیا اور قرآن مجید میں اس اعلانِ براءت کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔ ایسا شخص گویا اللہ تعالیٰ کی تکذیب کرتا ہے' لہٰذا اہل علم نے اس کے قتل کو واجب قرار دیا ہے۔

☆ بلکہ ''موسوعة الاجماع'' میں تو یہاں تک لکھا ہے کہ:

من تشکک ببراة السیدة عائشةؓ مما رمیت به صار کافراً مرتداً باجماع المسلمین (۱)

''جس نے سیدہ عائشہؓ پر لگائے گئے الزام سے ان کی براءت کے بارے میں شک کیا

وہ اہل اسلام کے اجماع کی رو سے کافر اور مرتد ہے''۔

☆ امام ابو محمد علی بن حزم الظاہریؒ اپنی سند سے ہشام بن عمارؒ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ میں نے امام مالکؒ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ:

''جو شخص سیدنا ابوبکر صدیق اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہما کو برا بھلا کہے اسے کوڑے لگائے جائیں گے اور جو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں زبان درازی کرے اسے قتل کر دیا جائے گا۔ ان سے کہا گیا کہ سیدہ عائشہؓ کے سلسلے میں وہ قتل کیوں ہوگا؟ فرمایا: اس لیے کہ سیدہ عائشہؓ کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ﴿يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ (النور) ''اللہ تمہیں نصیحت کرتا ہے کہ پھر کبھی بھی ایسا کام نہ کرنا' اگر تم مؤمن ہو''۔ اب جو ان پر الزام لگاتا ہے وہ قرآن کی مخالفت کرتا ہے اور جو مخالفِ قرآن ہو اُسے قتل ہی کیا جائے گا''۔

اس کے بعد امام ابن حزمؒ لکھتے ہیں کہ:

''امام مالکؒ کا یہ قول درست ہے۔ یہ صریح ارتداد ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے سیدہ عائشہؓ کی قطعی براءت کی تکذیب ہے''۔(۲)

ابوالحسن الصقلی' قاضی ابوبکر الطیبؒ کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:

ان اللّٰه تعالٰی اذا ذکر فی القرآن ما نسبه الیه المشرکون سبح نفسه لنفسه ' کقوله تعالٰی ﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ﴾ [البقرة:١١٦] **وذکر تعالی ما نسبه المنافقون الی عائشة فقال : ﴿وَلَوْ لَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا سُبْحٰنَكَ﴾**[النور:١٦] **سبح نفسه فی تبرئتها من السوء کما سبح نفسه فی تبرئته من السوء' وهذا یشهد لقول مالک فی قتل من سب عائشة' ومعنی هذا' واللّٰه اعلم' ان اللّٰه لما عظم سبها کما عظم سبه وکان سبها سباً لنبیه' وقرن سب نبیه واذاه باذاه تعالٰی ' وکان حکم مؤذیه تعالی القتل ' کان موذی نبیه کذلک**(۳)

''جب اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ان عیوب و نقائص کا ذکر کیا جو مشرکین اس کی طرف منسوب کرتے تھے تو اپنی ذات کے لیے اپنے آپ کو اس سے پاک قرار دیا' جیسا کہ ارشاد فرمایا: ''ان مشرکوں نے کہا کہ اللہ کی اولاد ہے' (نہیں) بلکہ وہ تو (اس سے)

پاک ہے''۔اسی طرح جب اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی اس تہمت کا ذکر کیا جو وہ سیدہ عائشہؓ پر لگاتے تھے تو فرمایا:''تم نے ایسی بات کو سنتے ہی کیوں نہ کہہ دیا کہ ہمیں ایسی بات منہ سے نکالنی بھی لائق نہیں۔یا اللہ تو پاک ہے''۔تو اللہ تعالیٰ نے سیدہ عائشہؓ کو برائی سے پاک (بری) قرار دیتے ہوئے بھی اپنی پاکیزگی بیان فرمائی اور خود اپنی ذات کو عیوب سے پاک اور منزہ قرار دیتے ہوئے بھی اپنی پاکیزگی کا ذکر کیا۔اس سے امام مالکؒ کے اس قول کو تقویت ملتی ہے کہ سیدہ عائشہؓ کو برا بھلا کہنے والا قتل کر دیا جائے گا۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ نے سیدہ عائشہؓ کو گالی دینے کو ایک بڑا معاملہ سمجھا جیسا کہ خود اپنی ذات کو برا بھلا کہنا اس کی نظر میں بہت بڑا جرم ہے۔سیدہ عائشہؓ کو گالی درحقیقت اللہ کے رسول ﷺ کو گالی دینے کے مترادف ہے اور رسول اللہ کو سبّ وشتم اور تکلیف پہنچانا حقیقت میں اللہ کو اذیت دینا ہے۔تو چونکہ اللہ کو تکلیف دینے والے کی سزا قتل ہے لہٰذا یہی حکم اس کے رسولؐ کو اذیت پہنچانے والے کا ہے''۔

علامہ ابوبکر ابن العربیؒ فرماتے ہیں:

ان اهل الافک رموا عائشة المطهرة بالفاحشة فبرأها اللّٰه ' فکل من سبها بما برأها اللّٰه منه فهو مکذب للّٰه' ومن کذب اللّٰه فهو کافر' فبهذا طریق قول مالک' وهی سبیل لائحة لاهل البصائر[٤]

''اہل افک نے سیدہ عائشہ مطہرہؓ پر بے حیائی کا الزام لگایا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی براءت کا اعلان فرما دیا۔اب جو اُم المؤمنینؓ کو اس الزام کی وجہ سے برا بھلا کہتا ہے جس سے اللہ نے انہیں بری قرار دے دیا ہے تو وہ اللہ کی تکذیب کرتا ہے' اور تکذیبِ خدا کا مرتکب کافر ہے۔امام مالکؒ کا طریق استدلال بھی یہی ہے اور اہل بصیرت کے لیے یہ بالکل واضح ہے''۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے ایسے متعدد واقعات کا ذکر کیا ہے جن میں ان لوگوں کو قتل کیا گیا جنہوں نے سیدہ عائشہ ؓ پر بے حیائی کا الزام لگایا تھا۔چنانچہ کہتے ہیں کہ ابوبکر بن زیاد النیسابوری نے فرمایا:

سمعت القاسم بن محمد یقول لاسماعیل بن اسحاق آتی المامون بالرقة برجلین شتم احدهما فاطمة والآخر عائشة ' فامر بقتل الذی شتم فاطمة وترک الآخر' فقال اسماعیل : ما حکمهما الا ان یقتلا لانّ

الذی شتم عائشة ردّ القرآن

''میں نے قاسم بن محمدؒ کو اسماعیل بن اسحاق سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ مامون کے پاس دو آدمیوں کو پکڑ کر لایا گیا۔ ان میں سے ایک نے سیدہ فاطمۃ الزہراؓ کو گالی دی تھی اور دوسرے نے سیدہ عائشہ صدیقہؓ کو۔ تو اس نے حکم دیا کہ جس نے سیدہ فاطمہؓ کو گالی دی ہے اسے قتل کر دیا جائے جبکہ دوسرے کو چھوڑ دیا۔ یہ سن کر اسماعیلؒ کہنے لگے کہ ان دونوں کا حکم یہی ہے کہ دونوں کو قتل کیا جائے' کیونکہ سیدہ عائشہؓ کو گالی دینے والا قرآن کی تردید کرتا ہے''۔

یہ واقعہ ذکر کرنے کے بعد شیخ الاسلامؒ فرماتے ہیں کہ:

وعلی ھذا مضت سیرة اھل الفقة والعلم من اھل البیت وغیرھم

''اہل بیت اور دیگر علماء وفقہاء کا یہی طریقہ رہا ہے''۔

علاوہ ازیں شیخ الاسلام نے کئی دیگر واقعات اور اقوال بھی ذکر کیے ہیں جو کہ ذیل میں بیان کیے جاتے ہیں:

❁ ابوالسائب القاضیؒ کہتے ہیں کہ ''میں ایک دن سیدنا حسن بن زید کی مجلس میں تھا' وہاں ایک شخص نے سیدہ عائشہؓ کا تذکرہ بہت ہی برے انداز میں کیا اور بے حیائی کا ذکر کیا تو حسن بن زیدؒ نے فرمایا: ''اے لڑکے! اس کی گردن اڑادو''۔ علویوں نے ان سے کہا کہ:

ھذا رجل من شیعتنا' فقال: ''معاذ اللّٰہ' ان ھذا رجل طعن علی النبی ﷺ. قال اللّٰہ تعالی: ﴿اَلْخَبِیْثٰتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ وَالْخَبِیْثُوْنَ لِلْخَبِیْثٰتِ وَالطَّیِّبٰتُ لِلطَّیِّبِیْنَ وَالطَّیِّبُوْنَ لِلطَّیِّبٰتِ اُولٰٓئِکَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا یَقُوْلُوْنَ لَھُمْ مَّغْفِرَۃٌ وَّرِزْقٌ کَرِیْمٌ﴿۲۶﴾﴾ [النور] فان کانت عائشة خبیثة فالنبی ﷺ خبیث' فھو کافر' فاضربوا عنقه'' فضربوا عنقه.

''یہ شخص تو ہمارے گروہ میں سے ہے۔ تو انہوں نے فرمایا: اللہ کی پناہ! اس نے تو رسول اکرم ﷺ پر طعن کیا ہے۔ اللہ فرماتا ہے کہ: ''خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لائق ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لائق ہیں اور پاک عورتیں پاک مردوں کے لائق ہیں اور پاک مرد پاک عورتوں کے لائق ہیں۔ ایسے لوگوں کے متعلق بہتان باز جو کچھ بکواس کر رہے ہیں وہ ان سے بالکل مبرّا ہیں' ان کے لیے بخشش ہے اور عزت کی

روزی۔'' تو اگر (اس کے بقول) سیدہ عائشہؓ خبیث ہیں تو رسول اکرم ﷺ بھی خبیث ہوئے (**نعوذ بالله من هذا الكفر**) لہٰذا یہ کافر ہے' اس کا سرتن سے جدا کر دو''۔ چنانچہ انہوں نے اس کی گردن اڑا دی''۔

❁ سیدنا محمد بن زیدؒ 'جو کہ سیدنا حسن بن زیدؒ کے بھائی ہیں' کے بارے میں مروی ہے کہ ان کے پاس عراق سے ایک شخص آیا اور سیدہ عائشہ صدیقہؓ کا ذکر برے انداز سے کیا' انہوں نے ایک موٹا بانس پکڑا اور اس کے دماغ پر مار کر اسے قتل کر دیا۔ ان سے کہا گیا کہ یہ تو ہمارے ہی گروہ کا آدمی تھا! اس کے جواب میں محمد بن زیدؒ نے فرمایا:

هذا سمى جدى قرنان ' ومن سمى جدى قرنان استحق القتل فقتلته

''اس نے میرے جدگرامی (رسول اکرم ﷺ) کو بے غیرت کہا' اور جو ایسا کہے وہ قتل ہی کا مستحق ہے' لہٰذا میں نے اسے قتل کر دیا''۔

''قرنان'' ایسے شخص کو کہتے ہیں جو بیوی وغیرہ کے معاملے میں بے غیرتی کا مظاہرہ کرے۔ گویا سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اگر کسی غلطی کی مرتکب تھیں تو رسول اکرم ﷺ اس سے چشم پوشی کر کے آخر کس شے کا مظاہرہ کرتے رہے۔ نعوذ بالله من هذا الكفر والضلال۔

❁ قاضی ابویعلیٰؒ فرماتے ہیں:

من قذف عائشة بما برأها الله منه كفر بلاخلاف' وقد حكى الاجماع على هذا غير واحد ' وصرح غير واحد من الائمة بهذا الحكم

''جو سیدہ عائشہؓ پر تہمت لگاتا ہے وہ بلا اختلاف کافر ہے۔ اس سلسلے میں اجماع کا ذکر کئی علماء نے کیا ہے اور متعدد ائمہ نے اس حکم کی صراحت کی ہے''۔

❁ ابوموسیٰ (عبدالخالق بن عیسیٰ بن احمد بن جعفر الشریف الہاشمی' اپنے زمانہ کے حنابلہ کے امام) فرماتے ہیں:

ومن رمى عائشة رضى الله عنها بما برأها الله منه فقد مرق من الدين ولم ينعقد له نكاح على المسلمة(۵)

''جو سیدہ عائشہؓ پر الزام لگائے جس سے اللہ تعالیٰ نے انہیں بری کر دیا ہے وہ دین سے نکل جاتا ہے اور کسی مسلمان عورت کے ساتھ اس کا نکاح نہیں ہو سکتا''۔

❁ امام ابن قدامہ المقدسیؒ رقم طراز ہیں کہ:

''ازواجِ رسولؐ اُمہات المؤمنین المطہرات کے لیے ''ترضی'' (رضی اللہ عنہا کہنا) سنت ہے جو کہ ہر برائی سے بریٔ الذمہ ہیں۔ان میں سے افضل ترین سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا اورسیدہ عائشہ بنت الصدیق رضی اللہ عنہا ہیں جن کی براءت کا اظہار اللہ نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔وہ دنیا وآخرت میں آپؐ کی بیوی ہیں۔جو بھی ان پر وہ الزام لگاتا ہے جس سے اللہ انہیں بری کر چکا ہے تو وہ خدائے بزرگ و برتر سے کفر کرتا ہے''۔(٦)

❁ امام نوویؒ حدیث افک سے حاصل ہونے والے فوائد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

الحادیة والاربعون : براء ۃ عائشة رضی اللّٰہ عنہا من الافک وھی براءۃ قطعیة بنص القرآن العزیز' فلو تشکک فیہا انسان' والعیاذ باللّٰہ' صار کافراً مرتداً باجماع المسلمین. قال ابن عباس وغیرہ : لم تزن امرأۃ نبی من الانبیاء صلوات اللّٰہ وسلامہ علیہم اجمعین' وھذا اکرام من اللّٰہ تعالی لھم (٧)

''مذکورہ حدیث میں اکتالیسواں فائدہ یہ ہے کہ اس سے سیدہ عائشہؓ کی براءت ثابت ہوتی ہے اور قرآن عزیز کی نص کی رو سے یہ براءت قطعی ہے۔اگر کوئی انسان اس میں شک کرے' والعیاذ باللہ' تو مسلمانوں کے اجماع کی رو سے وہ کافر اور مرتد ہو جائے گا۔ سیدنا ابن عباسؓ اور دیگر اہل علم کا قول ہے کہ انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام میں سے کسی نبی کی بیوی بھی زنا کی مرتکب نہیں ہوئی اور یہ اللہ کی طرف سے ان کے لیے اعزاز ہے''۔

❁ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر الزام لگانے والے کے کفر پر اجماعِ اُمت کا ذکر کرتے ہوئے علامہ ابن القیم الجوزیہؒ کہتے ہیں:

واتفقت الامة علی کفر قاذفھا (٨)

''سیدہ عائشہؓ پر تہمت لگانے والے کے کفر پر اُمت کا اتفاق ہے''۔

❁ رأس المفسرین علامہ ابن کثیرؒ ارشادِ باری تعالیٰ ﴿**اِنَّ الَّذِیۡنَ یَرۡمُوۡنَ الۡمُحۡصَنٰتِ الۡغٰفِلٰتِ الۡمُؤۡمِنٰتِ لُعِنُوۡا فِی الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَۃِ ۪ وَلَہُمۡ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ ﴿ۙ۲۳﴾**﴾ (النور) ''جو لوگ پاک دامن' بے خبر مؤمن عورتوں پر تہمتیں لگاتے ہیں اُن پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی گئی ہے اور اُن کے لیے بہت بڑا عذاب ہے'' کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اجمع العلماء رحمھم اللہ قاطبة علی ان من سبھا بعد ھذا ورماھا بہ بما

رماها به بعد هذا الذی ذکر فی هذه الآیة فانه کافر لانه معاند القرآن[۹]

''تمام علماء کا اجماع ہے کہ جو اِس کے بعد سیدہ عائشہ ؓ کو برا بھلا کہے یا اس آیت میں جس الزام کا ذکر ہے اس کے بعد بھی وہی الزام لگائے تو وہ کافر ہے' کیونکہ وہ قرآن کو ٹھکراتا ہے''۔

❁ علامہ بدرالدین الزرکشیؒ فرماتے ہیں کہ:

من قذفها فقد کفر لتصریح القرآن الکریم ببراء تها[۱۰]

''جو سیدہ عائشہؓ پر تہمت لگاتا ہے وہ کافر ہے' کیونکہ قرآن کریم نے آپؓ کی براءت کی تصریح فرمائی ہے''۔

❁ امام جلال الدین السیوطیؒ سیدہ عائشہؓ کی براءت میں نازل ہونے والی سورۃ النور کی آیات ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ جَاءُ وْا بِالْاِفْکِ عُصْبَةٌ مِّنْکُمْ .....﴾ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

نزلت فی براءة عائشة رضی اللّٰه عنها فیما قذفت به' فاستدل به الفقهاء علی ان قاذفها یقتل لتکذیبه لنص القرآن' قال العلماء: قذف عائشة کفر لان اللّٰه سبح نفسه عند ذکره فقال: ﴿سُبْحٰنَکَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِیْمٌ﴾ کما سبح نفسه عند ذکر ما وصفه به المشرکون من الزوجة والولد[۱۱]

''یہ آیات سیدہ عائشہؓ پر لگائے گئے الزامات سے ان کی براءت کے سلسلہ میں نازل ہوئیں۔ اس سے فقہاء نے یہ استدلال کیا ہے کہ سیدہ عائشہؓ پر تہمت لگانے کا مرتکب قتل کر دیا جائے گا' کیونکہ اس نے نص قرآن کی تکذیب کی ہے۔ علماء نے یہ بھی کہا ہے کہ سیدہ عائشہؓ پر الزام لگانا کفر ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر کرتے ہوئے اپنی پاکیزگی بیان کی ہے جیسا کہ اس نے مشرکوں کے اُسے بیوی و اولاد سے متصف کرنے پر بھی اپنی پاکیزگی کا اظہار کیا ہے''۔

ائمۂ فقہاء و محدثین کے مندرجہ بالا اقوال سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ اس امر پر ساری اُمت متفق ہے کہ جو شخص زوجۂ رسولؐ اُم المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ ؓ کو برا بھلا کہے اور ان پر اہل افک کا عائد کردہ جھوٹا الزام عائد کرے باوجودیکہ اللہ تعالیٰ نے اس سے اُمّ المؤمنین کو بری کر دیا ہے' وہ کافر ہے' کیونکہ وہ صدیقہ کائناتؓ کی براءت وطہارت کے بارے میں اللہ کی دی گئی خبر کو جھٹلاتا ہے اور ایسے بدبخت شخص کی سزا یہ ہے کہ اسے ملت اسلام سے

مرتد ہو جانے کی بنا پر قتل کر دیا جائے گا۔

دیگر اُمّہات المؤمنین کو برا بھلا کہنے والے کا حکم

اوپر اُمّ المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں گستاخی و زبان درازی کرنے والے کا حکم تو ذکر کر دیا گیا ہے' اب آپؓ کے علاوہ دیگر ازواج مطہرات و امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن کو سبّ وشتم کرنے والے کے بارے میں ملت اسلامیہ کا نقطۂ نظر پیش کیا جاتا ہے۔

اس مسئلہ میں اہل علم سے دو قول منقول ہیں:

پہلا قول : اس حوالے سے ایک موقف یہ ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ دیگر اُمّہات المؤمنین کو برا بھلا کہنے والے کا حکم وہی ہے جو اُن کے سوا دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ہے۔ پھر اس نکتہ میں بھی کہ صحابہ کرامؓ کو سبّ وشتم کرنے والے کا حکم اور سزا کیا ہے' مختلف زاویہ ہائے نگاہ پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ:

(۱) اہل علم کے ایک گروہ کے نزدیک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو برا بھلا کہنے والا' ان کی تنقیص کرنے والا' ان کی عدالت میں طعن کا مرتکب اور ان سے اپنے بغض کا اظہار کرنے والا کافر ہے۔ ایسے شخص کا خون مباح اور اسے قتل کرنا جائز ہے' اِلّا یہ کہ وہ اپنے اس فعل شنیع سے توبہ کرے اور صحابہ کرامؓ کے لیے دعائے رحمت کرے۔

یہ نقطۂ نگاہ صحابیٔ جلیل القدر سیدنا عبدالرحمٰن بن ازی رضی اللہ عنہ' عبدالرحمٰن بن عمرو الاوزاعی' ابوبکر بن عیاش' سفیان بن عیینہ' محمد بن یوسف الفریابی' بشر بن حارث المروزی اور دیگر بہت سے علماء رحمۃ اللہ علیہم اجمعین نے اختیار کیا ہے۔

ان ائمہ نے شاتم صحابہؓ کے کفر کی تصریح کی ہے اور بعض نے اس امر کی بھی صراحت فرمائی ہے کہ اسے قتل کی سزا دی جائے گی۔ مذاہب اربعہ اور ظاہری مذہب کے بعض علماء سے بھی یہی رائے منقول ہے۔

(۲) علماء کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سبّ وشتم کرنے والے کی اس بنا پر تکفیر تو نہیں کی جائے گی' لیکن اسے فاسق اور گمراہ قرار دیا جائے گا' اور اسے قتل کرنے کے بجائے سخت تعزیری سزا دی جائے گی اور اس پر سختی کی جائے گی تاوقتیکہ وہ اپنے اس جرم سے باز آ جائے جو فواحشِ محرمات اور کبیرہ گناہوں میں شامل ہے۔ اگر وہ اس قبیح فعل سے نہ رکے تو اس کو سزا دی جاتی رہے یہاں تک کہ وہ تائب ہو جائے۔

یہ موقف اپنانے والوں میں عمر بن عبدالعزیز، عاصم الاحول، امام مالک، امام احمد رحمہم اللہ اور اِن کے بعد آنے والے اہل علم کی کثیر تعداد شامل ہے۔

بہرحال ان میں سے جس رائے کو بھی ترجیح دی جائے، بعض علماء کے نزدیک سیدہ عائشہؓ کے علاوہ دوسری ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کو برا بھلا کہنے والے سے وہی سلوک کیا جائے گا جو صحابہ کرامؓ پر سبّ وشتم کرنے والے سے ہوگا۔

دوسرا قول : مسئلہ زیر بحث میں دوسرا قول یہ ہے کہ جو اُمّہات المؤمنین میں سے کسی ایک پر بھی بے حیائی کا الزام لگائے گا تو اس کا انجام وہی ہے جو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگانے والے کا ہے۔

قول راجح

ان میں سے دوسرے قول کو ترجیح حاصل ہے، جیسا کہ بہت سے اہل علم نے اس کی تصریح کی ہے، جس کی توضیح ذیل میں کی جاتی ہے۔

سعید بن منصور، ابن جریر طبری، طبرانی اور ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہم نے روایت کیا ہے کہ ترجمان القرآن سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے سورۃ النور پڑھی اور پھر اس کی تفسیر بیان فرمائی۔ جب آیۂ مبارکہ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ ......الآیۃ﴾ (النور:٢٣) پر پہنچے تو فرمایا:

هذه فی عائشة وازواج النبی ﷺ ولم یجعل لمن فعل ذلک توبة ' وجعل لمن رمی امرأة من المؤمنات من غیر ازواج النبی ﷺ التوبة' ثم قرأ ﴿وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ﴾ الی قوله: ﴿اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا.....الآیۃ﴾ (النور:٤'٥) ولم یجعل لمن قذف امرأة من ازواج النبی ﷺ توبة ثم تلا هذه الآیة: ﴿لُعِنُوْا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ﴾ (النور) فهم بعض القوم ان یقوم الی ابن عباس فیقبل رأسه لحسن مافسر[١٢]

''یہ آیت سیدہ عائشہؓ اور رسول اکرم ﷺ کی دیگر ازواج مطہراتؓ کے بارے میں نازل ہوئی اور ان پر تہمت لگانے والے کے لیے اللہ تعالیٰ نے توبہ نہیں رکھی۔ اگر کوئی نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہراتؓ کے علاوہ کسی اور مؤمن عورت پر الزام لگاتا ہے اس

کے لیے تو توبہ رکھی ہے‘ اس کے لیے بطور دلیل یہ آیت پڑھی کہ ’’جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں اور پھر چار گواہ پیش نہیں کرتے.....‘‘ اس کے بعد ہے: ’’مگر وہ لوگ جو توبہ کر لیں.....‘‘ لیکن ازواجِ نبیؐ پر الزام لگانے کے مرتکب کے لیے توبہ کا ذکر نہیں۔ اس کی دلیل میں یہ آیت پڑھی کہ ’’ان پر دنیا و آخرت میں لعنت کی گئی ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے‘‘۔ ابن عباسؓ کی یہ بات سن کر لوگوں نے چاہا کہ اُٹھ کر آپؓ کے سر کو بوسہ دیں کہ کیا خوبصورت تفسیر بیان فرمائی ہے‘‘۔

❁ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ:

’’سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ واضح کر دیا کہ مذکورہ آیت ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ﴾ اس شخص کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو سیدہ عائشہؓ اور دوسری امہات المؤمنینؓ پر تہمت لگاتا ہے‘ کیونکہ ان پر تہمت لگانا رسول اکرم ﷺ پر طعن اور عیب لگانے کے مترادف ہے۔ اس لیے کہ کسی عورت پر بے حیائی کا الزام اس کے خاوند کے لیے باعث اذیت ہے‘ جیسا کہ اس کے بیٹے کے لیے ہے‘ کیونکہ اس سے اس شخص کی طرف بے غیرتی کی نسبت ہوتی ہے اور اس کے بستر کی خرابی ظاہر ہوتی ہے۔ عورت کا زنا کرنا اس کے خاوند کو انتہائی تکلیف اور دکھ دیتا ہے۔ اسی بنا پر شریعت نے مرد کے لیے یہ جائز قرار دیا ہے کہ جب اس کی بیوی زنا کرے تو وہ اس پر الزام لگا سکتا ہے اور لعان کے ذریعے اس سے حد ساقط کر دی ہے‘ جبکہ خاوند کے علاوہ کسی اور کو اجازت نہیں کہ وہ کسی بھی صورت میں کسی عورت پر الزام لگا سکے‘‘۔(۱۳)

اسی طرح علماء کی کثیر تعداد نے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ رسول معظم ﷺ کی باقی ازواج مطہراتؓ کا بھی وہی حکم ہے جو اُمّ المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہے۔

❁ امام ابنِ حزمؒ سیدہ عائشہؓ پر تہمت لگانے کو کامل ارتداد اور اللہ تعالیٰ کی تکذیب قرار دینے کے بعد لکھتے ہیں:

وکذلک القول فی سائر امهات المؤمنین ولا فرق لان اللّٰه یقول:

﴿وَالطَّیِّبٰتُ لِلطَّیِّبِیْنَ وَالطَّیِّبُوْنَ لِلطَّیِّبٰتِ اُولٰٓئِکَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا یَقُوْلُوْنَ﴾ (النور:۲۶) **فکلهن مبرآت من قول افک‘ والحمد للّٰه ربّ العالمین**(۱۴)

’’دیگر اُمہات المؤمنینؓ کے بارے میں بھی یہی حکم ہوگا‘ اس سلسلے میں کوئی فرق نہیں‘

کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لیے ہیں اور پاک باز مرد پاک باز عورتوں کے لیے ہیں۔ یہ ان تمام الزامات سے بری ہیں جو یہ (منافق) کہتے ہیں'' لہٰذا تمام ازواجِ مطہراتؓ بہتان سے بالکل مبرا ہیں۔ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا ربّ ہے''۔

❁ قاضی عیاضؒ نے ابن شعبانؒ (محمد بن قاسم بن شعبان ابواسحٰق ابن القرطبی سیدنا عمار ابن یاسر رضی اللہ عنہ کی نسل سے ہیں' مصر کے مالکی فقہاء کی چوٹی کی شخصیت' متوفّٰی ۳۵۵ھ) کے بارے میں ذکر کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا:

''جس نے سیدہ عائشہؓ کے علاوہ کسی اور زوجۂ رسولؐ کو برا بھلا کہا تو اس کے بارے میں دو قول ہیں: ایک یہ کہ اسے قتل کیا جائے گا' کیونکہ اس نے رسول اکرم ﷺ کی اہلیہ محترمہ کو گالی دے کر خود آپؐ ہی کی ذات اقدسؐ کو گالی دی ہے۔ اور دوسرا یہ کہ اس کا حکم تمام صحابہ کرامؓ والا ہے' یعنی اس پر جھوٹے کی حد لگے گی۔ پھر فرمایا کہ: **وبالأول اقول**[۱۵] (میں بھی پہلے نقطۂ نظر ہی کا قائل ہوں)۔''

❁ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اس سلسلے میں پہلا قول نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

والثانی وھو الاصح انه من قذف واحدة من امهات المؤمنین فهو کقذف عائشة رضی اللّٰه عنها ..... وذلک لأن هذا فیه عار وعضامنة علی رسول اللّٰه ﷺ ' واذی له اعظم من اذاه بنکاحهن[۱۶]

''دوسرا موقف یہ ہے اور یہی درست ہے کہ اُمہات المؤمنین میں سے کسی ایک پر بھی تہمت لگانے والا سیدہ عائشہؓ پر الزام لگانے والے ہی کی طرح ہے' کیونکہ اس میں رسول اکرم ﷺ پر طعن اور انتہائی سخت الزام ہے اور یہ آپؐ کے لیے اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے کہ کوئی ازواجِ مطہراتؓ سے نکاح کرے''۔

❁ عظیم مفسر قرآن امام ابن کثیرؒ کہتے ہیں:

وفی بقیة امهات المؤمنین قولان : اصحهما انهن کهی[۱۷]

''باقی امہات المؤمنین کے بارے میں دو قول ہیں' اور دونوں میں سے صحیح تر یہ ہے کہ وہ سب بھی سیدہ عائشہ صدیقہؓ ہی کی مانند ہیں''۔

وجوہِ ترجیح قول ثانی

زیر بحث مسئلہ میں دوسرے قول کی ترجیح کے لیے دلائل میں غور وفکر کیا جائے تو معلوم

ہوگا کہ درج ذیل تین وجوہ کی بنا پر یہی قابل ترجیح ہے۔

وجہ اوّل :محض کسی پاک دامن عورت پر الزام لگانا دنیا و آخرت میں اللہ کی لعنت کا باعث نہیں بنتا' جیسا کہ سورۃ النور کی آیت ﴿ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَرۡمُوۡنَ الۡمُحۡصَنٰتِ الۡغٰفِلٰتِ الۡمُؤۡمِنٰتِ.....﴾ میں ہے کہ: ﴿لُعِنُوۡا فِی الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَۃِ﴾اور پھر ﴿الۡمُحۡصَنٰتِ الۡغٰفِلٰتِ الۡمُؤۡمِنٰتِ.....﴾ میں لام عہد کا ہے (۱۸) اور معہود ازواجِ رسولؐ ہیں' کیونکہ پیچھے قصۂ افک کا ذکر ہے اور سیدہ عائشہؓ پر الزام لگانے والوں کا ذکر ہے۔ گویا یہاں عام لفظ کو اُس کے سبب تک محدود رکھا جا رہا ہے' کیونکہ ایسے قرائن و دلائل موجود ہیں۔ جیسا کہ سیدنا ابن عباسؓ کا قول اوپر گزر چکا ہے۔

وجہ دوم :دُنیا و آخرت میں لعنت کی وعید اللہ تعالیٰ نے صرف مُحصَنٰت' غٰفِلٰت' مُؤمِنٰتِ پر تہمت لگانے والے کے لیے رکھی ہے۔ سورۃ النور کے آغاز میں ارشاد فرمایا کہ:

﴿وَالَّذِیۡنَ یَرۡمُوۡنَ الۡمُحۡصَنٰتِ ثُمَّ لَمۡ یَاۡتُوۡا بِاَرۡبَعَۃِ شُهَدَآءَ فَاجۡلِدُوۡهُمۡ ثَمٰنِیۡنَ جَلۡدَۃً وَّلَا تَقۡبَلُوۡا لَهُمۡ شَهَادَۃً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ۙ﴾

''اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگائیں' پھر چار گواہ نہ پیش کر سکیں' تو انہیں اسّی کوڑے لگاؤ اور کبھی بھی ان کی گواہی قبول نہ کرو۔ اور یہ فاسق لوگ ہیں''۔

یہاں محض ایک پاک دامن خاتون پر تہمت کی سزا کوڑے بتائی اور اسے فاسق قرار دے کر اس کی گواہی ردّ کرنے کا حکم دیا' تو لازم ہے کہ جو خاتون محض ایک عام پاک دامن ہی نہ ہو' بلکہ اَلۡمُحۡصَنَات الۡغَافِلَات الۡمُؤۡمِنَات میں سے ہو' اس کے لیے ایک خاص مقام و مرتبہ اور فضیلت ہونی چاہیے' لہٰذا اُمہات المؤمنین رضی اللہ عنہن عام مؤمن خواتین سے بلند تر درجے کی حامل ہیں' کیونکہ ان کے ایمان دار ہونے کی تو گواہی دے دی گئی ہے کہ وہ مؤمنوں کی مائیں ہیں اور دنیا و آخرت میں رسول اکرم ﷺ کی بیویاں ہیں' جبکہ دیگر عام مؤمن خواتین ظاہر میں تو مؤمن ہیں لیکن ان کی باطنی کیفیت کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

مزید برآں یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سیدہ عائشہؓ کے قصہ میں فرمایا:

﴿وَالَّذِیۡ تَوَلّٰی کِبۡرَهٗ مِنۡهُمۡ لَهٗ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ ﴿۱۱﴾﴾ (النور)

''اور ان میں سے جس نے اس کے بہت بڑے حصے کو سرانجام دیا ہے اس کے لیے عذاب بھی بہت ہی بڑا ہے۔''

یہاں اس کام کے اصل سرغنہ کے لیے عذابِ عظیم کی تخصیص سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسی کے لیے ہے۔ اور فرمایا:

﴿وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِيْ مَآ اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾ (النور)

''اور اگر دنیا و آخرت میں تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم نے جس بات کے چرچے شروع کر رکھے تھے یقیناً اس بارے میں تمہیں بہت بڑا عذاب پہنچتا۔''

اور یہ بات معلوم ہے کہ عذابِ عظیم ہر الزام لگانے والے کے لیے نہیں ہے' بلکہ اصل سرغنہ کے لیے ہے۔ یہ تو تھا سیدہ عائشہؓ کا واقعہ۔ اب دیکھئے کہ تمام اُمہات المؤمنینؓ اور ازواجِ رسولؐ کا ذکر کرتے ہوئے بھی یہی الفاظ فرمائے:

﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾ (النور)

''اور اُن (یعنی دیگر ازواج مطہرات پر الزام لگانے والوں) کے لیے بھی عذابِ عظیم ہے''۔

اس سے واضح طور پر یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ جو اُمہات المؤمنینؓ میں سے کسی ایک پر بھی تہمت کا مرتکب ٹھہرتا ہے وہ اس کام کا بڑا حصہ انجام دینے کا مرتکب اور عذابِ عظیم کا مستحق ہے۔ لہٰذا تمام اُمہات المؤمنین کا ایک ہی حکم ہوا۔

وجۂ سوم : اُمہات المؤمنین رضی اللہ عنہن پر الزام اور تہمت لگانے سے چونکہ رسول اکرم ﷺ کو اذیت پہنچتی ہے' اس لیے اس کے مرتکب پر دنیا و آخرت میں لعنت کی گئی ہے اور سیدنا ابن عباسؓ نے اسی بنا پر فرمایا کہ: **لیس فیھا توبة** (اس میں توبہ کی گنجائش نہیں)۔ لہٰذا رسول معظم ﷺ کو تکلیف اور دکھ دینے والے کی اس الزام سے توبہ اس وقت تک قبول نہ ہوگی جب تک وہ دوبارہ اسلام نہ لے آئے۔ یہی وجہ ہے کہ ازواجِ مطہرات اور اُمہات المؤمنینؓ پر الزام لگانا ایسا نفاق ہے جو خون کو مباح کر دیتا ہے اور اسے قتل کرنا ضروری (واجب) ہے' جبکہ اسے یہ بھی معلوم ہو کہ اُمہات المؤمنینؓ آخرت میں بھی رسول اکرم ﷺ کے عقدِ زوجیت کے شرف سے نوازی جائیں گی۔ پھر یہ بھی طے شدہ بات ہے کہ کسی نبی کی بیوی نے کبھی بھی زنا کا ارتکاب نہیں کیا۔

ویسے تو یہ امر کسی دلیل کا محتاج نہیں کہ رسول اکرم ﷺ کی ازواجِ مطہراتؓ پر تہمت آپؐ کے لیے باعث اذیت ہے' لیکن اس کی صریح دلیل خود آپؐ ہی کے فرمان سے ملتی ہے۔ چنانچہ

واقعۂ افک کے سلسلہ میں مروی حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((یا معشر المسلمین من یعذرنی من رجل قد بلغنی اذاہ فی اھل بیتی فو اللّٰہ ما علمت علی اھلی الا خیرًا' ولقد ذکرو ا رجلاً ما علمت علیہ الا خیرًا وما کان یدخل علی اھلی الامعی (۱۹)

''اے مسلمانوں کے گروہ! اس شخص سے میرا بدلہ کون لے گا جس کی اذیت دینے والی بات میرے گھر والوں کی نسبت سے مجھ تک پہنچی ہے؟ بخدا میں اپنے گھر والوں کے بارے میں سوائے بھلائی کے اور کچھ نہیں جانتا۔ اور انہوں نے ایک شخص کا ذکر کیا' اس کے باب میں بھی سوائے خیر کے میں کسی شے سے واقف نہیں اور وہ میرے اہل خانہ کے پاس صرف میرے ساتھ ہی گیا ہے''۔

مذکورہ بالا تین وجوہ کی بنا پر یہی نقطۂ نظر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تمام اُمہات المؤمنینؓ پر تہمت اور الزام عائد کرنے کی سزا وہی ہے جو سیدہ عائشہؓ کے سلسلہ میں بیان ہوئی ہے۔

حاصلِ کلام

مندرجہ بالا بحث کا حاصل یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن پر سبّ و شتم کرنا' یا ان کے بارے میں سوءِ ظن رکھنا یا زبانِ طعن دراز کرنا انتہائی قبیح فعل ہے جو گناہِ کبیرہ سے بھی بڑھ کر ہے اور ایمان و اسلام کی تباہی و بربادی کا باعث اور دنیا و آخرت میں رحمتِ خداوندی سے محرومی کا موجب ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اُمہات المؤمنینؓ کا حقیقی ادب و احترام کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے اور ان کی عزت و توقیر کے تقاضوں کا صحیح فہم عطا فرمائے۔ آمین یا الٰہ العالمین!

حواشی

(۱) موسوعة الاجماع فی الفقه الاسلامی:۲/۱۰۴۹' دار الفکر' دِمَشق' طبعة ثانیة۔

(۲) ابن حزم' المحلی : ۱۳/۵۰٤۔

(۳) القاضی عیاض' الشفاء : ۲٦۷' ۲/۲٦۸۔

(٤) ابن العربیؒ' احکام القرآن : ۳/۱۳٦۵۔

(۵) احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیةؒ' الصارم المسلول علی شاتم الرسول' ص ۵٦٦-۵٦۸۔

(٦) لمعة الاعتقاد' ص ۲۹۔

(۷) یحیی بن شرف الدین النوویؒ، شرح صحیح مسلم: ۱۱۷، ۱۱۸/۱۷۔

(۸) ابن القیم الجوزیةؒ، زاد المعاد: ۱/۱۰۶۔

(۹) عماد الدین ابن کثیرؒ، تفسیر القرآن العظیم: ۵/۷۶۔

(۱۰) الاجابة لایراد ما استدرکته عائشة علی الصحابة، ص ۴۵۔

(۱۱) الاکلیل فی استنباط التنزیل، ص ۱۰۹۔

(۱۲) جلال الدین السیوطیؒ، الدر المنثور: ۶/۱۶۵۔ **نیز دیکھئے** جامع البیان: ۱۸/۱۰۴۔

(۱۳) ابن تیمیةؒ، الصارم المسلول، ص ۴۵۔

(۱۴) ابن حزمؒ، المحلی: ۱۳/۵۰۴۔

(۱۵) القاضی عیاضؒ، الشفاء: ۲/۲۶۹۔

(۱۶) ابن تیمیةؒ، الصارم المسلول، ص ۵۶۷۔

(۱۷) ابن کثیرؒ، تفسیر القرآن العظیم ۵/۷۶۔

(۱۸) **عربی زبان میں الف لام (اَلْ) کی کئی قسمیں ہیں، جن میں سے ایک الف لام عہد کا ہوتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جس پر یہ داخل ہو اس کی مراد متعین ہو۔ اگر وہ خارج میں متعین ہو تو 'عہدِ خارجی' کہتے ہیں۔ جیسے: ﴿فَعَصٰی فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ﴾ اب یہاں 'الرَّسُوْلَ' سے مراد سیدنا موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ اور اگر وہ شے خارج کے بجائے صرف ذہن میں متعین ہو تو اسے ''عہد ذہنی'' کہتے ہیں۔ جیسے: ﴿وَاَخَافُ اَنْ یَّاْکُلَهُ الذِّئْبُ﴾. زیر بحث آیت میں الف لام عہد خارجی ہے۔**

(۱۹) محمد بن اسماعیل البخاریؒ، الجامع الصحیح، کتاب المغازی، باب حدیث الافك، رقم الحدیث: ۳۸۲۶۔ نیز: مسلم بن حجاج القشیریؒ، الصحیح، کتاب التوبة، باب حدیث الافك وقبول توبة القاذف، رقم الحدیث: ۴۹۷۴۔

1

گوشۂ خواتین

اسلام‘ شادی اور دورِ جدید کے تقاضے

مسز الماس حمیری‘ لندن

اچھا رشتہ نہیں ملتا! لڑکی بوڑھی ہو رہی ہے! ہماری لڑکی ابھی بچی ہے اس لیے شادی کا سوچا ہی نہیں! آج کا معاشرہ بہت پڑھا لکھا ہے‘ اس لیے ہم بھی بچیوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائیں گے! یہ وہ جملے ہیں جو ہمیں روزمرہ زندگی میں سننے کو ملتے ہیں‘ مگر ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ اسلام میں شادی کے کیا احکامات ہیں اور دورِ جدید کے کیا تقاضے ہیں؟ آج شادی ہمارے لیے نزع کا عالَم کیوں ثابت ہو رہی ہے؟ یہی وہ سوالات ہیں جن کا جواب پیشِ نظر مضمون میں ڈھونڈنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ حضرت ابوسعید خدری اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

> ’’جس کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ اولاد دے تو اسے چاہیے کہ اس کا اچھا نام رکھے‘ اور اس کو اچھی تربیت دے اور سلیقہ سکھائے‘ پھر جب وہ سن بلوغ کو پہنچے تو اس کے نکاح کا بندوبست کرے۔ اگر شادی کی عمر کو پہنچ جانے کے بعد بھی اس کی شادی کا بندوبست نہ کیا گیا تو اس کے حرام میں مبتلا ہونے کا ذمہ دار اُس کا باپ ہوگا‘‘۔ (شعب الایمان‘ بحوالہ معارف الحدیث‘ جلد ششم)

درج بالا حدیث مبارکہ میں ارشاد ہے کہ جس کو اللہ اولاد دے تو وہ اس کا اچھا نام رکھے۔ یعنی اچھا نام رکھنا بھی مسلمان والدین کے فرائض میں سے ہے اور اس کی تاکید کی گئی ہے۔ آج ایسا دیکھنے میں آ رہا ہے کہ مسلمان جب اپنے وطن کو چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں جاتے ہیں تو وہاں کے لوگوں کے ساتھ گھل مل جانے کے لیے اپنا اسلامی نام بدل کر ان گوروں جیسا نام ہی رکھ لیتے ہیں اور اپنی پہچان ختم کرا دیتے ہیں۔ مگر جیسا کہ ہم جانتے ہیں‘ اسلامی احکام وآداب کچھ ظواہر پر لاگو ہوتے ہیں اور کچھ باطن پر۔ انسان کی شخصیت پر نام بھی بہت اثر رکھتا ہے۔ شاید اسی لیے ہمیں باقاعدہ حکم دیا گیا ہے کہ اچھا نام رکھو‘ کیونکہ اس کا اثر ظواہر پر ہے۔

اس کے ساتھ ہی نبی اکرم ﷺ نے اولاد کی اچھی تربیت اور سلیقہ شعاری کا حکم دیا۔ یہاں توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ اچھے نام کے فوراً بعد آپؐ نے تربیت اور سلیقہ کا حکم دیا نہ کہ علم حاصل کرنے کا۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ انسان کی پیدائش کے بعد جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہوتی ہے وہ اس کی تربیت ہے' کیونکہ اس کے اٹھنے بیٹھنے ہی سے پتا چلتا ہے کہ ماں باپ نے اس کی کیسی تربیت کی ہے۔ مگر ہمارے ہاں معاملہ کچھ اور ہی ہے' ہم لوگ بچے کے پیدا ہوتے ہی اس فکر میں پڑ جاتے ہیں کہ اسے کون سے سکول میں داخل کرائیں۔ آج اکثر و بیشتر ایسا سننے کو ملتا ہے کہ والدین بچوں کے پیدا ہوتے ہی سکول میں ان کے نام لکھوا دیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اولاد کی نعمت مل جانے کے بعد اس کی دنیا بنانے کی فکر میں لگ جاتے ہیں۔ مگر ہمارے نبی ﷺ نے بچے کی پیدائش کے فوراً بعد مسلمانوں کو جس فکر میں لگنے کا حکم دیا ہے وہ اس کی تربیت اور سلیقہ ہے۔

تربیت اور سلیقہ

مندرجہ ذیل الفاظ اتنے عام ہیں کہ پڑھا لکھا اور اَن پڑھ ہر کوئی ان کا مطلب سمجھتا ہے اور عام طور پر بڑے بوڑھے بچوں کو اِن الفاظ میں تربیت دیتے رہتے ہیں: جھوٹ نہ بولو' چوری کرنا بری بات ہے' بڑوں کا ادب کرو' وغیرہ وغیرہ۔ مگر افسوس ہے کہ آج کل یہ عادات بھی بہت کم پائی جاتی ہیں۔ اس کی وجوہات بہت سی ہیں' مثلاً میڈیا' ماحول اور سب سے بڑی وجہ ہے مغرب کی نقالی۔ حدیث کا اصل منشا یہ ہے کہ بچوں کی تربیت اور سلیقہ قرآن وسنت کے مطابق ہونا چاہیے نہ کہ مغربی تہذیب کے مطابق!

متذکرہ بالا حدیث کے مطابق چوتھی بات جو حضرت محمد ﷺ نے ہم لوگوں کو سکھائی ہے وہ یہ کہ بچوں کی شادی جلدی کر دی جائے۔ یعنی سن بلوغ کے فوراً بعد بچوں کی شادی ہو جانی چاہیے۔ یہ فرمان مرد اور عورت دونوں پر لاگو ہوتا ہے۔ مگر آج اکیسویں صدی میں یہی نظر آتا ہے کہ والدین اور خاندان والے دونوں کی شادی جلدی نہیں ہونے دیتے' بلکہ دونوں کی شادی میں دیر کرنے کے لیے ایسے ایسے جملے اور محاورے سننے کو ملتے ہیں جن کو سن کر انسان واقعتاً اسی روش پر چل پڑتا ہے جس روش پر سارا معاشرہ چل رہا ہوتا ہے۔

ہمارے ہاں لڑکوں کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ ابھی ہمارے بیٹے نے پاؤں پر کھڑے ہونا ہے' بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کرنی ہیں' مستقبل بنانا ہے' وغیرہ۔ حالانکہ آج کے

معاشرے میں والدین لڑکوں کو اُن کے پاؤں پر کھڑا کرتے کرتے ان کو جہنم کے گڑھے کے قریب لا کھڑا کرتے ہیں۔ اصل میں تو ہمیں دیکھنا یہ چاہیے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے‘ اس کی وجہ کیا ہے؟ وجوہات تو بہت سی ہیں‘ مگر سب سے بڑی وجہ مغرب کی اندھی تقلید ہے!

مغرب میں پہلے ہی عیسائیوں کا یہ حال تھا کہ شادی کو برا مانا جاتا تھا‘ حالانکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایسی کوئی تعلیم نہیں دی تھی‘ مگر ان کے پیروکاروں نے رہبانیت کے نام پر ایسی پابندیاں اپنے اوپر لاگو کر لی تھیں جن کا نتیجہ یہ نکلا کہ اہل کلیسا جنسی بے راہ روی کا شکار ہو گئے۔ یہ معاملہ تو مذہبی پیشواؤں کا تھا‘ دوسری طرف عوام جہاں مذہب بس نام کی حد تک تھا‘ وہاں علم و تعلیم اور معلومات حاصل کرنے کا رواج بہت عام ہو گیا۔ ان کے ہاں بڑے بڑے سائنس دان پیدا ہوئے اور سننے میں آتا ہے کہ بعض شادی ہی نہیں کرتے تھے اور سارا وقت مختلف تجربوں میں لگا دیتے تھے۔ وہ چیزوں کی ایجاد میں بیشتر وقت تجربہ گاہوں میں ہی گزار دیتے تھے۔ ستاروں کی بدلتی حالت اور کائنات کی وسعت کی حقیقت تلاش کرتے کرتے اپنا زندگی کا بڑا حصہ اسی میں صرف کر دیتے تھے۔ آج کے دور میں بھی سائنس دان اگر کسی چیز کی کھوج میں لگ جائیں تو سارا وقت وہیں لگا دیتے ہیں۔ اگر آپ اخبار وغیرہ پر نظر رکھیں تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ یہی وہ عمل ہے جو انہیں گھریلو زندگی سے دور کر رہا ہے۔ آج یہ قوم اتنی مصروف ہے کہ کسی کے ساتھ اچھے تعلقات رکھنا تو دور کی بات ہے‘ مرتے ہوئے کے ساتھ ہمدردی کے بول بولنے کی بھی انہیں فرصت نہیں ہے۔

ان کے ہاں شادی نہ کرنے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مستحکم خاندانی نظام نہ ہونے کی بنا پر لڑکے لڑکیوں کو اپنی خوراک‘ تعلیم‘ بیماری اور گھر بار سب کے اخراجات خود اٹھانے پڑتے ہیں یا حکومت اٹھاتی ہے اور بالغ ہوتے ہی ماں باپ اولاد کو گھروں سے باہر نکال دیتے ہیں۔ ظاہر ہے اچھی نوکری اچھی تعلیم سے ملے گی اور اچھی تعلیم کے لیے پیسہ ہونا ضروری ہے‘ اور ان سب کاموں کے لیے توجہ اور وقت چاہیے۔ یہ سارے کام نبھاتے نبھاتے کم سے کم دس بیس سال گزر جاتے ہیں اور آخر کار وہ شادی کے بغیر رہنا شروع کر دیتے ہیں۔ علم اور تعلیم کا رجحان بڑھ جانے کے بعد سے مغرب کا یہ رواج ہے اور پتا نہیں کب تک چلے گا!

ہمارے ہاں ابھی الحمدللہ یہ صورت حال تو نہیں ہے کہ اولاد کو گھروں سے نکالا جائے۔ یہ اللہ کی رحمت ہے۔ لیکن پھر بھی ہمارے نوجوانوں کے حالات بھی کچھ ایسے ہی ہیں‘ بلکہ

مسلمان ماں باپ تو دوسروں کا بوجھ بھی ان پر ڈال دیتے ہیں۔لڑکوں بے چاروں کو تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنی بہنوں کی شادیوں کے لیے بھی بہت سارا پیسہ کمانا ہوتا ہے۔ظاہر ہے رسم و رواج پورے کرنے کی فکر اُن کو کھائے جاتی ہے اور شادی لیٹ ہو جاتی ہے۔

ماہنامہ میثاق بابت مئی ۲۰۰۷ء میں ''علامہ اقبال' قائداعظم اور نظریہ پاکستان' اور اس نظریئے سے انحراف کے نتائج'' کے عنوان سے بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ کے خطاب میں یہ واقعہ بیان ہوا ہے کہ ایک صاحب اپنے دوست کی والدہ کے انتقال پر تعزیت کے لیے گئے۔ وہ دوست بہت رو رہے تھے' اور یہ انہیں دلاسہ دے رہے تھے کہ اب صبر کرو۔اس نے کہا کہ میں صرف اپنی والدہ کے انتقال پر نہیں رو رہا ہوں' بلکہ میں تو اس بات پر رو رہا ہوں کہ میری آٹھ سال کی بچی نے مجھ سے یہ کہا کہ ابا جان! ہم اپنی دادی اماں کی ارتھی کو آگ کب لگائیں گے؟ سچ یہ ہے کہ گوروں اور ہندوؤں دونوں کا اثر آج ہم پر سائے کی طرح چھایا ہوا ہے اور آج ہمارا خاندانی نظام درہم برہم ہوا جا رہا ہے۔

اب ہم اپنے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔لڑکیوں کی شادی میں تأخیر کے سلسلے میں اکثر بیٹی کے لیے یہ جملہ استعمال ہوتا ہے کہ یہ تو ابھی بچی ہے' بھائی آج کل زمانہ بہت پڑھا لکھا ہے' ہمیں بیٹیوں کو پڑھانا ہے اور وکیل' ڈاکٹر' ٹیچر وغیرہ بنانا ہے۔لیکن یہ طرزِ عمل اسلامی تعلیمات کے بالکل خلاف ہے۔حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ان سے نبی اکرم ﷺ نے یہ فرمایا تھا:

((يَا عَلِيُّ ثَلَاثٌ لَا تُؤَخِّرْهَا : اَلصَّلَاةُ اِذَا آنَتْ ، وَالْجَنَازَةُ اِذَا حَضَرَتْ، وَالْاَيِّمُ اِذَا وَجَدْتَ لَهَا كُفْئًا))[1]

''اے علی! تین چیزوں میں تأخیر نہ کرو: (i) نماز جب اس کا وقت آ جائے' (ii) جنازہ جبکہ وہ موجود ہو' اور (iii) بے شوہر عورت (کے نکاح میں) جبکہ تمہیں اس کے میل کا کوئی رشتہ مل جائے''۔

مذکورہ بالا حدیث مبارکہ میں جن تین چیزوں میں تأخیر نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ نماز' جنازہ اور نکاح ہیں۔ یہ وہ کام ہیں جن میں ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیئے' کیونکہ حدیث کی رو سے یہ بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔

☆ نماز: نماز مسلمان کا بنیادی فرض ہے۔کلمۂ شہادت کے بعد مسلمانوں کا لازمی اور

بنیادی فریضہ نماز ہے۔ نماز کو دین کا ستون قرار دیا گیا ہے۔ ایک حدیث کے الفاظ ہیں: ((مِفْتَاحُ الْجَنَّةِ الصَّلَاةُ)) [۲] ''جنت کی کنجی نماز ہے''۔ نماز کے بارے میں اتنی احادیث ہیں کہ ان سب کو اکٹھا کر کے لکھنے کی کوشش کریں تو ایک علیحدہ کتاب بن جائے گی۔ مگر ہمارا اصل مقصد یہاں یہ بتانا ہے کہ نماز کا وقت پر ادا کرنا کتنا لازم ہے۔ مگر ہمارے ہاں نماز تو بس مذہبی لوگوں کا کام رہ گیا ہے اور عوام اس کو وقت پر ادا کرنا تو دور کی بات ہے اسے ضروری ہی نہیں سمجھتے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ سب کو ہدایت دے۔ آمین!

☆ جنازہ: دوسرا حکم جو حدیث مبارکہ میں آیا ہے وہ ہے ''جنازہ''۔ یہاں ذرا سوچنے کی بات ہے کہ نماز تو ایک فرض ہے' اس کا تو وقت پر ادا کرنا سمجھ میں آتا ہے' مگر جنازے کے متعلق ایسا کیا معاملہ ہے جس میں جلدی کرنے کے لیے کہا گیا ہے؟ ایسا لگتا ہے کہ یہ حکم آج کے دور کے لیے ہی دیا گیا ہے۔ کیونکہ دیکھنے میں آیا ہے کہ باہر کے ملکوں میں جب کسی کا کوئی عزیز فوت ہو جاتا ہے تو فوت شدہ لوگوں کو جہاز کے ذریعے اپنے اپنے ملک میں واپس بھیج دیا جاتا ہے جس سے دفنانے میں تأخیر ہوتی ہے۔ اسی طرح غیر مناسب وجوہات کو بنیاد بنا کر تدفین میں خواہ مخواہ غفلت کی جاتی ہے جو کہ شرعاً درست نہیں اور اس سے منع کیا گیا ہے۔

☆ نکاح: اس حدیث میں تیسری اور آخری بات جو حضرت محمد ﷺ نے فرمائی وہ ''نکاح'' ہے۔ فرمایا کہ جب بے شوہر عورت کے لیے تمہیں اس کے میل کا کوئی رشتہ مل جائے' یعنی جب مناسب لڑکا مل جائے تب اس کی شادی کر دی جائے۔ اور ظاہر ہے کہ رشتہ تلاش کرنے سے ہی ملے گا۔ جب لڑکی سن بلوغ کو پہنچ جائے تو رشتہ کی تلاش کر دینی چاہیے' نہ کہ دنیاوی بندشیں لگا کر اسے مزید ڈگریاں حاصل کرنے کی طرف بھیج دیں۔ مگر آج جدید دور میں اس حکم کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ ہم جدید دور کے تقاضوں کو پورا کرنے میں مصروف ہیں۔

یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ ان تینوں باتوں کا تعلق ''دین اسلام'' سے ہے نہ کہ ''مذہب اسلام'' سے۔ دین اسلام سے مراد اسلام بطور مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ نماز کا تعلق عبادات سے ہے' جنازے کا تعلق معاشرے سے ہے اور نکاح کا تعلق گھریلو زندگی سے ہے۔ اسلامی معاشرے میں یہ چیزیں بہت اہم ہیں جن کا اسلامی تعلیمات کے مطابق لاگو ہونا بہت ضروری ہے۔ جب تک نماز کا وقت نہیں ہوتا اُس وقت تک پڑھی نہیں جا سکتی' لیکن جب وقت

ہو جائے تو فوراً سب کام چھوڑ کر پڑھنی چاہیے۔ اسی طرح جنازے کا حکم ہے کہ جب کوئی فوت ہو جائے تو فوراً اس کو دفنا دینا چاہیے' اور اسی طرح جب لڑکی سن بلوغت کو پہنچ جائے تب سے ہی اس کے نکاح کی فکر کرنی چاہیے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے ہاں لڑکی کا سن بلوغ کیا ہے۔ سن بلوغ کی حد پندرہ سال ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب سے اس کی شادی کی فکر شروع کرنی چاہیے اور جتنا جلد ممکن ہو شادی کر دینی چاہیے۔ لیکن ہم لوگ یہ کہہ کر کہ ''ابھی بچی ہے'' وقت گزارتے رہتے ہیں۔ اور اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ زمانہ بدل گیا ہے' ہمیں بچیوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلوانی ہے' اور یوں کہتے کہتے دس بیس سال ضائع کر دیتے ہیں۔ پھر بعض لڑکیوں کی تو شادی ہو ہی نہیں سکتی' بعض کی شادی چالیس سال کی عمر میں جا کر ہوتی ہے اور بعض اپنے تعلیمی معیار کے مطابق شادی کرنا چاہتی ہیں' لیکن وہ ہو نہیں سکتی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے بعض دین دار بہنوں کو دیکھا ہے کہ بیچاری گھر والوں کے بوجھ اٹھاتی اٹھاتی بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ شادی جلد نہ ہو سکنے یا سرے سے نہ ہونے کی ایک وجہ معاشرے کے غلط رسم و رواج ہیں۔ لوگ دور جدید کے تقاضے پورے کرتے کرتے لڑکیوں کی عمروں کو بڑھا دیتے ہیں اور بعض کے رشتے آنے بند ہو جاتے ہیں۔ آخر اس معاملے میں اتنی پیچیدگیاں کیوں؟

یہ حقیقت ہے کہ ہم نے قرآن وسنت کو پس پشت ڈال دیا ہے اور ان کو صرف بزرگوں کی جاگیر کہہ کر چھوڑ دیا ہے۔ ہم قرآن و حدیث پر عمل نہیں کر پاتے اور بہانہ یہ بناتے ہیں کہ ''زمانہ بدل گیا ہے''۔ ہم پرانی باتوں اور قرآن و حدیث کو دقیانوسی سمجھتے ہیں۔ (نعوذ باللہ!) حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ انسان کے لیے زندگی گزارنے کا بہترین طریقہ اگر کہیں ہے تو وہ صرف قرآن وسنت میں ہے۔ بعض بہن بھائی یہ سوال کرتے ہیں کہ ہم لڑکیوں کو تعلیم نہ دلوائیں؟ اس سے ہماری مراد ہرگز نہیں ہے' تعلیم ضرور دلوائیں' مگر شریعت کی حدود کے اندر رہتے ہوئے۔ کچھ حضرات حضرت محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کو سامنے رکھتے ہوئے اتنی دور نکل جاتے ہیں کہ ملاقات مغرب سے ہو جاتی ہے۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے:

((طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ)) (۳)

''علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے''۔

اس حدیث کی روشنی میں سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کون سے علم کا حکم دیا جا رہا ہے

''قرآن وسنت'' کا یا مغربی اور مروّجہ علوم کا؟ ان میں سے کون سا علم حاصل کرنا فرض ہے؟ اس بات کا فیصلہ آج کے نام نہاد مسلمانوں نے یہ کیا ہے کہ دنیاوی علم یعنی آج کل کی تعلیم حاصل کرنا فرض ہے' نہ کہ قرآن وسنت کا علم (نعوذ باللہ!)

ہم اپنی بچیوں کو کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھیجنے کے لیے ہمہ تن تیار رہتے ہیں چاہے اس کے لیے ہمیں شریعت کی ہر حد توڑنی پڑے۔ اور اگر کچھ کہا جائے تو فوراً حدیث سامنے لے آتے ہیں کہ علم حاصل کرنا ہر مرد وعورت پر فرض ہے۔ اس مقام پر ہمارے مسلمان بہن بھائیوں کو سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا چاہیے کہ یہ ارشاد گرامی کس ہستی کا ہے؟ ظاہر ہے کہ رسول اکرم ﷺ کا فرمان ہے اور یہ بھی ہم بخوبی جانتے ہیں کہ آپؐ کا ہر فرمان ہماری آخرت کی کامیابی کے لیے ہے جو کہ حقیقی فلاح ہے اور اس کے لیے حقیقتاً جو علم ہر مسلمان مرد وعورت پر فرض کیا گیا ہے وہ ہے قرآن وسنت کا علم! ہمارا مقصود یہ قطعاً نہیں کہ دنیاوی علم حاصل نہ کیا جائے۔ دینی اور دنیاوی علم دونوں ہی انسانی تمدن کے اہم ترین تقاضے ہیں' انہیں ضرور حاصل کرنا چاہیے' مگر ایک کو فرض سمجھ کر اور دوسرے کو ضرورت سمجھ کر!

آج پوری دنیا میں سکولوں اور کالجوں میں جا کر تعلیم حاصل کرنے کا جو نظام چل رہا ہے وہ برطانیہ کے صوبہ سکاٹ لینڈ کی ایجاد ہے اور اسی لیے پوری دنیا میں یہ ملک علم حاصل کرنے کا بہت بڑا مرکز رہا ہے۔ اس کے تاریخی پس منظر کے لیے انٹرنیٹ سے مزید معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ آج کا تعلیمی نظام مغرب کا ہے' جہاں مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں ہے' جہاں عورت بھی بس چلا سکتی ہے اور مرد بھی' جہاں عورت بھی حکومت چلا سکتی ہے اور مرد بھی' دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اور صاف سی بات ہے کہ ان کا تعلیمی نظام ایسا ہی ہو گا جہاں وہ اکٹھے آگے بڑھ سکیں۔ مگر ہم سنت محمدی ﷺ کے پیروکار ہیں جس کے مطابق ہر چیز کا دائرہ کار مختلف ہے۔ ہم مسلمانوں کو اپنی شریعت کی حدود کو دیکھتے ہوئے عورتوں اور مردوں کی تعلیم کا نظام بنانا چاہیے نہ کہ مغرب کو دیکھتے دیکھتے اپنی بہو بیٹیوں کو سولہ سے بیس سال تک تعلیم دلوائیں اور انہیں دوسرے ملکوں میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجیں۔ آپ بہن بھائی دیکھیں کہ حج جیسا مقدس فرض بھی ایک عورت دوسری عورتوں کے گروپ کے ساتھ جا کر ادا نہیں کر سکتی جب تک اُس کے ساتھ کوئی محرم نہ ہو' تو پھر جوان بیٹیوں کو کافر ملکوں میں اکیلے جا کر تعلیم حاصل کرنے کا جواز کہاں سے مل سکتا ہے؟ لہٰذا ہمیں سوچنا چاہیے کہ اپنی بیٹیوں کو کب

تک اور کس دائرے میں رہ کر تعلیم دلوانی چاہیے۔ قرآن وسنت کی تعلیم تو اپنے ملک اور اپنے گھر میں رہ کر حاصل کی جاسکتی ہے تو پھر انہیں بیرونِ ملک کیوں بھیجا جائے؟ اس کے لیے ضرورت سے زیادہ وقت کیوں ضائع کیا جائے؟ علامہ اقبال کہتے ہیں:

خوش تو ہم بھی ہیں جوانوں کی ترقی سے مگر
لب خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ!

مذکورہ بالا تمام باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمیں اپنی اولاد کی دنیا اور آخرت دونوں کی فکر کرنی چاہیے۔ ان کو پڑھائیں بھی اور ان کے سن بلوغ کو پہنچ جانے پر فوراً شادی کی فکر میں لگ جائیں۔ والدین بیٹیوں کی شادی کی فکر میں جلد لگ جائیں گے تو ذاتِ رحمٰن ورحیم کی رحمت سے کوئی نہ کوئی موزوں رشتہ جلد ہی مل جائے گا اور اس طرح ایک اسلامی اور خوبصورت معاشرہ وجود میں آسکے گا۔ ہمارے پیارے رسول ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی شادی کم عمری میں انجام پائی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کم عمری کی شادی میں فائدہ ہے نہ کہ نقصان۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کم عمری میں انسان بیرونی اثرات کو جلدی قبول کرتا ہے اور اگر اچھا ماحول اور زندگی گزارنے کا بہترین موقع فراہم ہو جائے تو انسان زیادہ مفید بن کر سامنے آتا ہے، جس کا نمونہ ہمیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حیاتِ مبارکہ سے ملتا ہے۔ ان کی بہت سی خوبیاں ہمارے سامنے موجود ہیں، مگر یہاں صرف ایک خوبی پر اکتفا کرتے ہیں کہ وہ ہماری معلّمہ بنی تھیں۔

اسلامی باتوں کو تو ہم آسانی سے نظر انداز کر دیتے ہیں، مگر آج اگر سائنس کوئی بات ثابت کر دے تو وہ سب کے لیے حرفِ آخر ہو جاتی ہے۔ تو سنیے! ابھی حال ہی میں کم عمری کی شادی کا سائنس دانوں کی طرف سے بہت اچھا نتیجہ سامنے آیا ہے۔ درج ذیل خبر ملاحظہ فرمائیے:

''نوجوان ماؤں کے ہاں پیدا ہونے والے پہلے بچوں کے سو سال تک زندہ رہنے کے بہترین امکانات ہوتے ہیں۔ یہ دعویٰ امریکہ میں سائنس دانوں نے ۱۸۷۵ء تا ۱۸۹۹ء کے درمیان پیدا ہونے والے ۱۹۸ بچوں کی فیملی ہسٹری کی تشکیل نو کے بعد کیا

ہے۔انہوں نے پتا چلایا کہ دوسرے بچوں کے مقابلے میں پہلے بچے کے سو سال تک جینے کا امکان دوگنا ہوتا ہے۔ نیو سائنٹسٹ جریدے میں بتایا گیا ہے کہ ان افراد کے سو سال کے بعد بھی زندہ رہنے کے دگنے امکان ہیں جن کی ماؤں کی عمر ۲۵ سال سے کم ہو۔تحقیق کرنے والوں نے اس کے لیے ماؤں کی عمر کو اہم قرار دیا ہے' کیونکہ اس عمر میں بارآوری زیادہ بہتر ہوتی ہے اور یہ عمر بیماری سے محفوظ رہنے کے لیے بھی بہترین ہے۔تحقیق کرنے والوں کی قیادت یونیورسٹی آف شکاگو کے ڈاکٹر نٹالیا نے کی اور رپورٹ اس ہفتے جیرونٹولوجیکل سوسائٹی کو پیش کی جائے گی''۔

شاید اس خبر کو پڑھ کر دورِ جدید کے تقاضوں کو پورا کرنے والے مسلمانوں کو رسول اللہ ﷺ کے ارشادِ مبارک کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔اللہ ہمیں اسلام کا صحیح فہم عطا فرمائے اور اپنے معاشرتی رویوں کو اس کے مطابق ڈھالنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔آمین یاربّ العالمین!

حواشی

(۱) سنن الترمذی' کتاب الصلاۃ' باب ما جاء فی الوقت الاول من الفضل۔

(۲) سنن الترمذی' کتاب الطھارۃ' باب ما جاء ان مفتاح الصلاۃ الطھور۔

(۳) سنن ابن ماجہ' کتاب المقدمۃ' باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم۔

1

جدید دنیائے اسلام

قسط وار سلسلہ (50)

سعودی عرب (۲)

تحقیق وتحریر: سید قاسم محمود

''میثاق'' کے بعض محترم قارئین نے بجا طور پر یہ شکایت کی ہے کہ سعودی عرب کے حالات' جو دوسرے ملکوں کی نسبت قدرے زیادہ تفصیل سے تحریر کیے جاتے ہیں' اکثر چھوٹے مسلم ملکوں کے حالات سے بھی بہت کم بیان کیے گئے ہیں۔ اس شکایت کے ازالے کے طور پر یہ قسط پیش کی جا رہی ہے۔ یاد رہے کہ اس سلسلۂ مضامین کے تحت ہر مسلم ملک کے حالاتِ حاضرہ (سیاسی و معاشی) پر توجہ کی جاتی ہے اور ماضی بعید سے صَرفِ نظر کیا جاتا ہے۔ ان ملکوں کی آزادی کی جنگوں اور احیائی اسلامی تحریکوں کا بیان ''ندائے خلافت'' میں نومبر 2002ء سے قسط وار صورت میں شروع ہو کر اب تک 168 قسطیں شائع ہو چکی ہیں۔ (س'ق'م)

زمانۂ حال کی تاریخ

نویں صدی ہجری/پندرھویں صدی عیسوی کے آخر میں پرتگیزوں نے بحیرۂ روم سے بحیرۂ قلزم میں راستہ نکال لیا۔ 1498ء میں پرتگیزی جہاز راں واسکوڈی گاما کی' راس اُمید کا چکر کاٹنے کے بعد' ایک عرب جہاز راں احمد بن ماجد نے ہندوستان تک رہنمائی کی۔ پرتگیزی جہاز جلد ہی بحیرۂ قلزم میں نظر آنے لگے اور الفانسو ڈی البوقرق کی قیادت میں ان حملہ آوروں نے خلیج عمان کی بندرگاہوں اور ہرمز کی بڑی منڈی پر قبضہ کر لیا۔ الفانسو کے بھتیجے پیڈرو نے 1514ء میں خلیج فارس کا دَورہ کیا' لیکن اُس سے اگلے سال الفانسو فوت ہو گیا۔ اس طرح عدن کو سر کرنے اور مکہ معظّمہ پر چڑھائی کرنے کے باطل عزائم شرمندۂ تکمیل نہ ہونے پائے۔

1506ء سے شرف الدین یحییٰ سے زیدی اماموں کے ایک نئے سلسلے کا آغاز ہوا۔ اُس وقت سے بعد تک زیدی اپنا مرکزِ حکومت حتی الامکان صنعاء ہی میں قائم کرنے کی جانب مائل رہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُسی زمانے میں حبشہ سے یمن میں قہوہ لایا گیا اور لوگوں میں قات اور تمباکو

کا استعمال رائج ہوا۔

سلطان سلیم اوّل عثمانی نے، جس نے 1517ء میں مصر کو فتح کیا، خادم ''الحرمین'' کا معزز لقب اختیار کیا اور اس کے بیٹے سلیمان قانونی کے عہد حکومت (1520ء۔1566ء) میں کئی اور علاقے سلطنتِ عثمانیہ میں شامل ہو گئے۔ پرتگیزوں نے ہرمز کے حکمران سے اتحاد کر کے بحرین پر حملہ کیا اور اس پر قابض ہو گئے۔ پرتگیزوں کی اس جارحانہ حکمت عملی کا ترکوں میں ردِعمل ہوا اور انہوں نے بھی خلیج فارس اور بحیرۂ قلزم میں مستعدی دکھانا شروع کی۔ 1534ء میں سلطان سلیمان نے بغداد میں بحرین کے امیروں سے حلفِ وفاداری لیا۔ بعدازاں اس کی فوجوں نے یمن کی پہاڑیوں میں زور شور سے کارروائی شروع کر دی۔ کچھ عرصے کے لیے عدن اور مسقط پر قبضہ کر لیا گیا اور الحساء میں ایک ترک حاکم مقرر کر دیا گیا۔

1560ء کے بعد سے کم و بیش ساٹھ سال کے عرصے میں عمان میں کوئی اباضی امام نہیں ہوا، جہاں غیر مذہبی امراء اپنے مستحکم پہاڑی مرکزوں میں اپنی قوت کے نقطۂ عروج کو پہنچ گئے۔

سلطان سلیمان کے عہد میں حاصل کردہ عروج کے بعد عثمانی سلطنت زوال پذیر ہونے لگی اور اس کے آثار دیگر مقامات کی طرح عرب میں بھی نظر آنے لگے تھے۔ خشکی کے راستوں سے تجارت کے رُخ کا افریقہ کے گرد سے ہو کر جانے والے سمندری راستے کی طرف مڑ جانا اُس سنگین اقتصادی انحطاط کا باعث بن گیا جو مشرق قریب پر عہد جدید کے شروع میں طاری ہو گیا۔ آسٹریا، ہنگری اور دیگر یورپی دشمنوں کے علاوہ ترکوں کو ایرانی صفویوں کا بھی مقابلہ کرنا پڑا، جن میں سے سب سے طاقتور عباس اوّل نے خلیج فارس میں ایک توسیع پسندانہ حکمت عملی اختیار کی اور 1602ء میں بحرین پر قبضہ کر لیا۔ یمن میں زیدی اماموں نے ترکوں کی مزاحمت جاری رکھی اور المؤید محمد 1635ء میں انہیں ملک سے مکمل طور پر نکال دینے میں کامیاب ہو گیا۔

1600ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام بحیرۂ قلزم اور خلیج فارس میں انگریز تاجروں کی بڑے پیمانے پر سرگرمی کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ ایرانیوں سے اتحاد کر کے انگریزوں نے 1622ء میں پرتگیزوں کو ہُرمُز سے نکال دیا۔ جب پرتگیزی اجارہ داری ختم ہو گئی تو انگریزوں کو ولندیزیوں سے مقابلہ کرنا پڑا، جنہوں نے سترھویں صدی کے نصف آخر میں تجارتی فوقیت حاصل کر لی تھی۔

1624ء میں ناصر بن مرشد ازدی یعربی کے اباضی امام منتخب ہو جانے کے بعد امامت ایک صدی سے زائد عرصے تک اسی کے خاندان میں رہی۔ اپنے ابتدائی ایام میں بنو یعرب نے پرتگیزوں کو مسقط اور ان دوسری جگہوں سے، جہاں انہوں نے اپنے قدم جما رکھے تھے، نکال باہر کیا اور آگے چل کر انہوں نے اپنا حلقۂ اقتدار سمندر پار مشرقی افریقہ میں واقع ممباسہ، یمبہ اور کلوہ تک وسیع کر لیا۔

خاندان افراسیاب کے تیسرے اور آخری پاشا حسین بن علی نے، جس کے عہد میں سترھویں صدی کے دوران البصرہ عملی طور پر عثمانی حکومت سے آزاد ہو گیا تھا، قبیلہ بنوخالد کے آلِ حُمید کو 1663ء میں الحسا کے عثمانی حاکم سے گلوخلاصی کرنے پر اکسایا۔ ان بدوی سرداروں نے مشرقی عرب کے نخلستانوں اور چراگاہوں کو اپنی مرضی کے تحت رکھا، یہاں تک کہ تیرھویں صدی ہجری کے اوائل میں وہابیوں نے خلیج فارس کی طرف پیش قدمی کی۔

حضرموت میں یمن کے زیدیوں نے شافعی مذہب کے مقابلے پر اپنے عقائد کی ترویج و اشاعت کی سعی کی۔ 1660ء کے قریب حکمران زیدی امام کے ایک بھتیجے احمد بن الحسن نے حضرموت میں ایک خوفناک لشکر کی قیادت کی، جو رات کے سیلاب ''سیل اللیل'' کے نام سے مشہور ہے اور جس نے خاندانِ کثیر کی حیثیت کو کم کر دیا، لیکن زیدیت اس خطے میں شافعیت پر مستقل فتح حاصل کرنے میں ناکام رہی۔

محمد بن عبدالوہاب

بارھویں صدی ہجری/اٹھارویں صدی عیسوی میں اُس اصلاحی تحریک کے فروغ سے عرب میں ایک نئے دَور کا آغاز ہوا، جس کے بانی محمد بن عبدالوہاب (1703ء۔1792ء) تھے۔ ایک اعتبار سے اس تحریک سے سارے مشرق قریب و وسطیٰ کی جدید تاریخ کا آغاز بھی ہوتا ہے۔ اُس وقت توحید و رسالت کے ان علاقوں میں شرک و ظلم کا دَور دَورہ تھا۔ سب کچھ دین اور مذہب کے نام پر ہوتا تھا۔ سیاسی حالات بہت ابتر اور منتشر تھے۔ بدعات کو دین سمجھ کر کیا جاتا تھا۔ ایسے حالات میں عینیہ کے ایک علمی گھرانے میں محمد بن عبدالوہاب پیدا ہوئے۔ اُن کے والد عبدالوہاب عینیہ اور حرمیلا میں عہدۂ قضا پر مأمور تھے۔

ابن الوہاب بچپن ہی سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی طرف مائل تھے۔ قدرت نے انہیں غیر معمولی حساس دل دیا تھا۔ اردگرد کی بستیوں اور قصبوں میں مذہبی اور اخلاقی انحطاط کے حالات دیکھ کر کبیدہ خاطر ہوتے۔ مدینہ منورہ میں محمد حیات سندھی سے استفادے کے بعد حدیث پر گہری نظر ہوئی تو انہیں چاروں طرف گمراہی اور بدعات کا ایک سیلاب نظر آیا۔ رسول کریم ﷺ کے حجرۂ مبارک کے قریب جاہلوں کی شرک و بدعات والی حرکات کی وجہ سے کافی تکلیف اور ذہنی اذیت سے دوچار ہوئے۔ انہوں نے اپنی دعوت اور تحریک کی بنیاد توحید کی پاکیزگی پر رکھی۔ ہر قسم کی عبادت کے لیے اللہ تعالیٰ کی ذات کو مخصوص کرنے پر زور دیتے۔ کلمۂ توحید کا بول بالا ان کا شعار تھا۔

ابن الوہاب نے کسی خوف اور جھجک کے بغیر توحید کی کھلی دعوت دی۔ غیر اللہ کے سامنے سر جھکانے' قبروں اور ولیوں سے مدد مانگنے' نیکوکار بندوں کو معبود بنانے سے روکنے کی کوشش کی۔ قبروں کی زیارت میں مسنون طریقے کے خلاف جو بدعتیں رائج ہوگئی تھیں ان کو مٹانے کے لیے اقدامات شروع کیے تو مخالفت کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ اعزہ واقارب درپئے آزار ہوگئے۔ خود اُن کے والد کو بھی بیٹے کا یہ طرزِ عمل پسند نہ آیا' لیکن ان تمام رکاوٹوں کے باوجود دعوت وتبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا اور عارض کے تمام قصبات میں آپ کی دعوت وتحریک متعارف ہونا شروع ہوئی۔ والد ماجد کی مخالفت اور سرد مہری کے باعث اس دعوت کی رفتار سست رہی۔ 1740ء میں والد کے انتقال کے بعد دعوت و تبلیغ میں سرگرمی پیدا ہوئی۔

قصبہ درعیہ میں آپ اپنے ایک شاگرد احمد بن سویلم کے ہاں ٹھہرے۔ درعیہ کے امیر محمد بن سعود سے رابطہ قائم ہوا۔ امیر آپ کی دعوت سے بہت متاثر ہوا۔ امیر نے شیخ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ دونوں کے درمیان آئندہ اقدامات کے بارے میں ایک معاہدہ ہوگیا۔ درعیہ کے قیام اور امیر محمد بن سعود کی نیک نامی نے دعوت کی کامیابی کے لیے راہ ہموار کردی۔ درعیہ میں شیخ نے وعظ ودرس کے حلقے قائم کیے۔ قیام درعیہ کے دوسرے سال امیر عینیہ نے بھی آکر بیعت کی اور اپنے علاقے میں شرعی حدود کے نفاذ کا عہد کیا۔ تھوڑے عرصے کے بعد حرمیلا کے لوگوں نے بھی بیعت کی۔

امیر محمد بن سعود اور اُن کے جانشین عبدالعزیز بن محمد بن سعود (جو 1765ء میں اپنے والد کی وفات کے بعد منصبِ امارت پر متمکن ہوئے) شیخ ابن الوہاب کی ہدایات پر مکمل طور پر عمل کرتے تھے۔ درعیہ میں زکوٰۃ اور خمس کا نظام نافذ تھا۔ امیر عبدالعزیز نے 1773ء میں ریاض کو فتح کیا۔ ریاض کی فتح کے بعد شیخ نے اپنی تمام تر توجہ تعلیم وتدریس پر مرکوز کردی' کیونکہ شیخ کو امیر عبدالعزیز پر کافی اعتماد تھا اور وہ بھی شیخ کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہ کرتے تھے۔

مختلف قصبوں میں دعوت کی قبولیت کے بعد شیخ نے دور دراز شہروں کے علماء' امراء اور قضاۃ کے پاس تبلیغی خطوط بھیجے۔ تمام مزاحمتوں کے باوجود آپ اپنی دعوت میں ہمہ تن مصروف رہے۔ خاندان سعود کی سیاسی ہمدردیاں اور مالی تعاون حاصل ہونے کی وجہ سے آپ کی دعوت بہت تھوڑے عرصے میں کافی حد تک دوسرے علاقوں میں متعارف ہوتی چلی گئی۔ خاندان سعود سے آپ کا جو تعلق قائم ہوا تھا وہ آپ کے بعد آپ کی اولاد اور خاندان سعود کی اولاد میں مستقل چلتا آرہا ہے۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب کی وفات جولائی 1792ء میں ہوئی۔

سعودی عرب کی بنیاد آلِ سعود نے رکھی' لیکن اردگرد کے عرب ممالک کے حالات سعودی عرب کے سیاسی کوائف پر اثر انداز ہوتے رہے۔ 1743ء میں یعربی اماموں کے خاندان کا عمان

میں خاتمہ ہوگیا' یعنی اسی زمانے میں جب ایرانی وہاں متمکن ہونے کی کوشش کررہے تھے۔ آل بوسعید کے احمد بن سعید نے حملہ آوروں کو باطنہ کے ساحل سے مار بھگایا اور امام کی حیثیت سے منتخب ہوگیا۔ آل بوسعید کے متأخر حکمرانوں نے مسقط کو اپنا دارالحکومت بنایا اور امام کا لقب ترک کردیا۔ پہلے تو وہ اپنے آپ کو محض سیّد کہنے لگے (حالانکہ انہیں رسول کریم ﷺ کی نسل سے ہونے کا کوئی دعویٰ نہ تھا) اور بعدازاں سلطان۔ ایرانیوں نے بھی بحرین پر اپنی سیادت تیس سال تک قائم رکھی' یہاں تک کہ 1783ء میں آل خلیفہ نے ان جزیروں پر قبضہ کرلیا اور اس تاریخ کے بعد سے عرب کا کوئی حصہ ایرانی حکومت میں نہیں رہا۔

نجد کی تیزی سے وسعت پذیر وہابی ریاست کی مکے کے شریفوں سے آویزش ہوگئی اور دونوں میں پندرہ سال تک جنگ جاری رہی (1791ء تا 1806ء)۔ آخر 1803ء میں پہلی بار سعودیوں نے مکہ معظّمہ پر قبضہ کرلیا۔ ابن الوہاب کی وفات کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد سعودی اقتدار مشرق کی سمت خلیج فارس تک جا پہنچا' جس کے ساحل پر وہ عمان تک پھیل گیا۔ جنوب میں وہابی مصلحین یمن اور حضرموت تک پہنچ گئے' حتیٰ کہ شمال میں ان کی افواج شام اور عراق کو پامال کرنے کی دھمکی دینے لگیں۔ عثمانی حکومت نے جواز خود اس سیلاب کو روکنے کے ناقابل تھی' مایوسی کے عالم میں مصر کے نئے حاکم محمد علی سے رجوع کیا۔

انیسویں صدی عیسوی میں عرب میں مسلم اور یورپی ممالک کی مداخلت پہلے سے کہیں زیادہ مؤثر اور وسیع تر ہوگئی۔ محمد علی نے پہلی سعودی حکومت کا اُس وقت قلع قمع کردیا جب اُس کی فوج نے 1818ء میں درعیہ پر قبضہ کرلیا۔ برطانوی حکومت نے پہلے تو مصریوں کی آمد کا خیر مقدم کیا' لیکن بعدازاں اس سے خوف زدہ ہوگئے۔ چنانچہ انہوں نے خلیج فارس کے عربوں کے خلاف اور اندرون عمان میں فوجی کارروائیاں شروع کردیں اور 1839ء میں عدن پر قبضہ کرلیا' جس کے بعد انگریزوں کا اثر و رسوخ بتدریج جنوبی اور مشرقی ساحلوں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا گیا اور عقبی علاقوں میں جا پہنچا۔

آل بوسعید کے مشہور حکمران سعید بن سلطان (عہد حکومت 1806ء تا 1856ء) کو اندرونِ عمان میں محض برائے نام اقتدار حاصل تھا' جہاں اس پر سعودیوں نے بہت سخت دباؤ ڈال رکھا تھا' جنہیں اُسے اکثر خراج بھی دینا پڑتا تھا۔ اپنے عہد کے اواخر میں اُس نے اپنی زیادہ تر توجہ اپنے مشرقی افریقہ کے مقبوضات کی جانب مبذول رکھی' لیکن اس کی وفات کے پانچ سال بعد انگریزوں نے زنجبار کی ایک الگ سلطنت قائم کردی جو مسقط سے بالکل آزاد تھی۔ بیسویں صدی میں منتخب شدہ اس تنہا اباضی امام کو انگریزوں نے تسلیم نہیں کیا اور دو سال کی حکومت کے بعد اسے 1871ء میں برطرف کر

دیا گیا۔ جو سلطان اس کے بعد آئے، وہ اندرون ملک کے مخالف اباضی قبائل کے مقابلے میں مسقط میں اپنی حیثیت قائم رکھنے کے لیے برطانوی تائید وحمایت پر بھروسا کرتے رہے۔

بیسویں صدی عیسوی کے دوران میں حضر موت میں خانہ جنگی عام ہوتی رہی، جہاں بہت سی طاقت اُن پیشہ ور سپاہیوں کے ہاتھ میں تھی جنہیں عدن کے پیچھے کے پہاڑوں سے لایا گیا تھا۔

محمد علی کی افواج کی تباہ کن ضربوں سے سعودی ریاست سخت جان ثابت ہوئی اور ترکی بن عبداللہ کے، جس نے اپنا دارالحکومت الریاض مقرر کیا، اور بعد ازاں اس کے بیٹے فیصل کے عہد میں اس نے اپنی قوت کو دوبارہ بحال کر لیا۔ اگرچہ الحجاز پر بھی قبضہ نہیں کیا گیا۔ 1865ء میں فیصل کی وفات کے بعد اُس کے بیٹوں میں جو خانہ جنگی ہوئی، اس سے سعودیوں کی قسمت پھر روبہ زوال ہو گئی اور اس سے مشرقی عرب کے ایک حصے پر عثمانی اقتدار کے دوبارہ قیام اور آل رشید کی نجد میں حکومت کے لیے راستہ صاف ہو گیا۔ خود الریاض پر بھی ان کا قبضہ ہو گیا۔ ترکوں نے یمن کے پہاڑی علاقوں میں بھی دوبارہ قدم جما لیے اور صنعا کو اپنا صدر مقام بنایا، لیکن وہ زیدی اماموں کی مزاحمت کو نہ کچل سکے۔ 1869ء میں نہر سویز کھل جانے سے، جس کے ذریعے استنبول اور جدہ کے درمیان سفر زیادہ آسان اور مختصر ہو گیا، ترکوں کو الحجاز میں زیادہ اچھی طرح نظم وضبط قائم رکھنے کا موقع مل گیا۔

تین بار سخت ہزیمت اٹھانے کے باوجود آل سعود فیصل کے پوتے عبدالعزیز کی قیادت میں دوبارہ اٹھ کھڑے ہوئے، جس نے 1902ء میں وہاں کے رشیدی حاکم سے الریاض چھین لیا۔ شمال میں بالآخر آلِ رشید کو مغلوب کرنے سے پہلے عبدالعزیز کو بیس سال تک لڑنا پڑا۔ 1913ء میں اُس نے ترکوں کو الحسا سے نکال دیا۔ اگرچہ دمشق سے مدینہ تک حجاز ریلوے کا افتتاح 1908ء میں ہو چکا تھا، ترکوں کو اس وقت مکہ معظّمہ سے دست بردار ہونا پڑا، جب 1916ء میں شریف الحسین بن علی نے برطانیہ کی شہ پر عرب بغاوت کا اعلان کر دیا۔ اس جنگ کے خاتمے کے ساتھ ہی عرب میں ترکوں کی حمایت کا خاتمہ ہو گیا اور زیدی امام یحییٰ بن محمد یمن میں مکمل طور پر خود مختار ہو گیا۔

1913ء میں سلطان مسقط کے مقابلے میں عمان میں ایک نیا اباضی امام منتخب ہوا۔ دو سال بعد اس امام کی فوج کے ہاتھوں مسقط پر قبضے کو روکنے کے لیے برطانیہ کو مداخلت کرنا پڑی۔ برطانیہ کی ثالثی سے 1920ء میں ایک معاہدہ عمل میں آیا، جس میں یہ طے ہوا کہ عمان کے لوگ اور سلطان مسقط کی حکومت ایک دوسرے کے داخلی معاملات میں دخل نہ دیں گے، لیکن 1954ء میں سلطان کی فوجوں نے، جن کی تربیت اور قیادت برطانوی افسروں نے کی، بعض ایسے مقامات پر قبضہ کر لیا جو پہلے مسقط کے پاس نہ تھے اور اس طرح امامت عمان کو چاروں طرف سے محصور کر لیا۔

اگرچہ شریف الحسین کو لوگوں نے عرب کا بادشاہ تسلیم کر لیا' لیکن جب سلطان عبدالعزیز بن سعود اور شریف حسین کے درمیان جنگ چھڑ گئی تو سلطان عبدالعزیز نے اسے شکست دی۔ الحجاز کی فتح کے بعد سلطان عبدالعزیز نے آلِ عائض اور ادریسیوں کی چھوٹی ریاستوں کے ان علاقوں کا بھی الحاق کر لیا جو عسیر اور تہامہ میں تھے۔ 1932ء میں سلطان عبدالعزیز ''**المملكة العربية السعودية**'' کا بادشاہ کہلانے لگا۔ اس نے ایک مختصر سی جنگ کے بعد 1934ء میں یمن کے امام یحییٰ کو ہزیمت دی' جس کے نتیجے میں نجران کو سعودی عرب میں شامل کر لیا گیا۔

1948ء میں ایک ناکام بغاوت کے دوران میں امام یحییٰ مارا گیا اور اس کا بیٹا احمد اس کا جانشین ہوا۔ ادھر جب 1953ء میں عبدالعزیز کا انتقال ہوا تو اس کا جانشین اس کا بیٹا سعود ہوا۔ اس طرح منظر عام سے ایسے دو بڑے بادشاہ غائب ہو گئے جنہوں نے ان مملکتوں کو' جن کی تشکیل اور رہنمائی وہ پچاس سال تک کرتے رہے تھے' اپنا نام دینے کے علاوہ اور بھی بہت کچھ کیا تھا۔

(جاری ہے)

اشاریہ ماہنامہ میثاق لاہور

۲۰۰۶ء، ۲۰۰۷ء

مرتب: محمد شاہد حنیف

قرآن وعلومِ قرآن

عاکف سعید، حافظ	سقوطِ ڈھاکہ اور ہمارا طرزِ عمل ☆	جنوری	۲۰۰۶	۳-۴
عبدالرشید عراقی	فتنۂ خلق قرآن اور امام احمد بن حنبلؒ	جنوری	۲۰۰۶	۳۹-۴۶
مختار حسین فاروقی	حرمتِ قرآن اور عظمتِ قرآن کے چند عملی روزمرہ پہلو	فروری	۲۰۰۶	۶۷-۷۰
محمد نفیس، شیخ	چار کے عدد کی اہمیت، چار حوالوں سے [قرآن اور ہماری زندگی]	جون	۲۰۰۶	۸۳-۹۰
عتیق الرحمٰن صدیقی	قرآن کی اصطلاح میں عالم کون ہے؟	ستمبر	۲۰۰۶	۵۶-۶۰
اسرار احمد، ڈاکٹر	قرآن اور سنت کا باہمی تعلق ☆	ستمبر	۲۰۰۶	۵-۲۹
عتیق الرحمٰن صدیقی	''قلبِ سلیم''۔ قرآنی تعلیمات کے تناظر میں	جنوری	۲۰۰۷	۵۴-۵۸
محبوب احمد خان	قرآن کریم پر مشرکین کے اعتراضات	فروری	۲۰۰۷	۵۵-۶۴
محمد اقبال یوسف	قرآن محفوظ کیوں ہے؟	مارچ	۲۰۰۷	۷۷-۸۲

ایمان وعقائد

اسرار احمد، ڈاکٹر	تیس دجال، دجالی فتنہ اور دجالِ اکبر [خطاب]	جنوری	۲۰۰۶	۵-۳۸
ابوبکر جابر الجزائری	وفات اور مرض الموت سے متعلق احکام [مترجم: عطاء اللہ ساجد]	فروری	۲۰۰۶	۳۹-۶۶
اسرار احمد، ڈاکٹر	حقیقت واقسامِ شرک [۶/اقساط]			
	فروری ۲۰۰۶، ص ۵-۲۴/ مارچ ۲۰۰۶، ص ۱۱-۳۰/ اپریل ۲۰۰۶، ص ۲۹-۴۸/ مئی ۲۰۰۶، ص ۲۳-۴۴/ جون ۲۰۰۶، ص ۵-۲۷/ جولائی ۲۰۰۶، ص ۵-۳۰			
اشفاق الرحمٰن خان	شفاعت کا شرعی مفہوم	جولائی	۲۰۰۶	۴۵-۴۸

محمد یونس جنجوعہ	کیا چھوٹے گناہ معمولی ہوتے ہیں؟	اگست ۲۰۰۶	۵۶-۶۲
اسرار احمد، ڈاکٹر	ایمان کی حقیقت واہمیت اور ثمرات ونتائج	دسمبر ۲۰۰۶	۵-۲۶
ابوبکر جابر الجزائری	مسجد نبوی اور نبی کریم ا کی قبر مبارک کی زیارت [مترجم: عطاء اللہ ساجد]		
		جنوری ۲۰۰۷	۷۹-۸۸
طاہر اسلام عسکری	شریعت کی چار بنیادی اصطلاحات [شرک]	اکتوبر ۲۰۰۷	۵۹-۷۰
عبدالسمیع	رب ہمارا	اکتوبر ۲۰۰۷	۲۷-۴۰
طاہر اسلام عسکری	شریعت کی چار بنیادی اصطلاحات-۲	نومبر ۲۰۰۷	۳۵-۴۸
عظمتِ رسالت			
عاکف سعید، حافظ	توہین رسالت پر مبنی کارٹون کی اشاعت اور اُمت مسلمہ☆	مارچ ۲۰۰۶	۳-۱۰
نوید احمد	توہین ناموسِ رسالت ا [فتنہ ڈنمارک تاریخی تناظر میں]	اپریل ۲۰۰۶	۵-۲۸
عتیق الرحمٰن صدیقی	ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر [عظمت رسالت]	مئی ۲۰۰۶	۸۸-۹۲
مختار حسین فاروقی	توہین ناموسِ رسالت سنگین جرم کیوں؟	مئی ۲۰۰۶	۷۴-۸۷
شہباز ہندی	اہانتِ رسول ا کے مجرموں کی تلاش	جون ۲۰۰۶	۷۱-۸۲
محمد منیر احمد	توہین رسالت کے حقیقی اسباب اور مسلمانوں کیلئے راہِ عمل	جولائی ۲۰۰۶	۴۹-۵۹
عاکف سعید، حافظ	پوپ کے بیان کا اصل جواب؟☆	اکتوبر ۲۰۰۶	۳-۴
اسرار احمد، ڈاکٹر	پوپ کی اسلام کے خلاف ہرزہ سرائی [پریس ریلیز]	نومبر ۲۰۰۶	۵
اسرار احمد، ڈاکٹر	منصب رسالت اور اس کا مقصد [سلسلۂ تقاریر-۱]	فروری ۲۰۰۷	۵-۳۰
اسرار احمد، ڈاکٹر	تکمیل رسالت اور اس کے لوازم [سلسلۂ تقاریر-۲]	مارچ ۲۰۰۷	۵-۲۸
عاکف سعید، حافظ	جرم ضعیفی کی سزا [برطانیہ حکومت کا رشدی ملعون کا ''سر'' کا خطاب دینا]	جولائی ۲۰۰۷	۳-۴
مسز آصف پراچہ	رسالتِ محمدی ا کی خصوصیات	نومبر ۲۰۰۷	۱۷-۲۳
فقہ واجتہاد			
عبدالرحمٰن الکاف	معاصر اسلامی ریاستوں میں غیر مسلموں کے قانونی اور مدنی حقوق	مارچ ۲۰۰۶	۴۶-۴۸
محمد زبیر، حافظ	شب برأت-ایک تحقیقی وتجزیاتی مطالعہ	ستمبر ۲۰۰۶	۳۷-۴۸

محمد زبیر، حافظ — محرمات [حرام اُمور جن سے بچنا اشد ضروری ہے- ۸/اقساط]
فروری ۲۰۰۶ء ص ۷۱-۸۶ مارچ ۲۰۰۶ء ص ۷۱-۸۴/ اپریل ۲۰۰۶ء ص ۷۱-۸۴/
جون ۲۰۰۶ء ص ۶۰-۷۰/ اگست ۲۰۰۶ء ص ۶۳-۷۶/ اکتوبر ۲۰۰۶ء ص ۷۰-۸۰/
نومبر ۲۰۰۶ء ص ۷۹-۸۸/ دسمبر ۲۰۰۶ء ص ۸۵-۸۴

محمد رشید عمر — انسانی شخصیت پر حلال وحرام کے اثرات — فروری ۲۰۰۷ — ۶۵-۷۲

عبادات

ابوبکر جابر الجزائری — زکوٰۃ' مسائل واحکام [مترجم: عطاء اللہ ساجد] — مارچ ۲۰۰۶ — ۵۳-۷۰
ابوبکر جابر الجزائری — مصارفِ زکوٰۃ' صدقۂ فطر [مترجم: عطاء اللہ ساجد] — اپریل ۲۰۰۶ — ۵۵-۶۳
ابوبکر جابر الجزائری — روزے کے احکام [مترجم: عطاء اللہ ساجد/ ۲/اقساط] جولائی ۲۰۰۶ء ص ۶۰-۷۴/ ستمبر ۲۰۰۶ء ص ۶۱-۷۶
عتیق الرحمٰن صدیقی — رمضان المبارک- تزکیہ وتربیت کا مہینہ — اکتوبر ۲۰۰۶ — ۳۹-۵۱
محمد یونس جنجوعہ — روزہ اور تہذیب نفس — اکتوبر ۲۰۰۶ — ۳۹-۵۱
ابوبکر جابر الجزائری — حج اور عمرہ [مترجم: عطاء اللہ ساجد/ ۲/اقساط] — نومبر ۲۰۰۶ء ص ۵۱-۶۷/ دسمبر ۲۰۰۶ء ص ۶۲-۷۴
محمد یوسف ضیا — ذوالحجہ کے دس دن: فضائل ومسائل — جنوری ۲۰۰۷ — ۵۹-۶۶
ابوبکر الجزائری — قربانی اور عقیقہ [مترجم: عطاء اللہ ساجد] — فروری ۲۰۰۷ — ۷۹-۸۸
ارشاد الرحمٰن — ماہِ رمضان اور تلاوتِ قرآن — ستمبر ۲۰۰۷ — ۵۵-۵۸
اسرار احمد، ڈاکٹر — صیام وقیامِ رمضان کی اہمیت، فرضیت اور حکمت [خطاب] — اکتوبر ۲۰۰۷ — ۷-۲۶
محمد یونس جنجوعہ — صوفی اور مجاہد — اکتوبر ۲۰۰۷ — ۵۱-۵۸
محمد زبیر، حافظ — کیا قتال فرضِ عین ہے؟ — نومبر ۲۰۰۷ — ۴۹-۶۹

اسلام کا نظامِ عدل

طاہر اسلام عسکری — قانون کی بالادستی، عدلیہ کی آزادی اور اسلام — اگست ۲۰۰۷ — ۶۵-۷۱
عتیق الرحمٰن صدیقی — تصورِ عدل- قرآن وسنت کی روشنی میں — اکتوبر ۲۰۰۷ — ۴۱-۵۰

حدود وتعزیرات

نوید احمد — حدود آرڈیننس پر اعتراضات کا جائزہ — اگست ۲۰۰۶ — ۴۱-۵۵

عاکف سعید، حافظ	حقوقِ نسواں بل؟ ☆	ستمبر ۲۰۰۶	۳-۴
محمد آصف احسان	حدود آرڈیننس اور مجوزہ حکومتی ترامیم	اکتوبر ۲۰۰۶	۶۵-۶۹
طاہر اسلام عسکری	اسلام میں تجدد پسندی-فکر غامدی [بسلسلہ حدود وتعزیرات-۱]	اکتوبر ۲۰۰۶	۸۱-۸۸
طاہر اسلام عسکری	اسلام میں تجدد پسندی-فکر غامدی [بسلسلہ حدود وتعزیرات-۲]	نومبر ۲۰۰۶	۶۸-۷۴
فرخ رضا	کیا رجم کی سزا صرف عادی مجرموں کیلئے ہے؟ [حدود آرڈیننس پر ٹی وی مذاکرہ]	نومبر ۲۰۰۶	۷۵-۷۸
عاکف سعید، حافظ	اللہ کے غضب کو دعوت مت دو [حدود آرڈیننس] ☆	دسمبر ۲۰۰۶	۳-۴
نوید احمد	تحفظ حقوقِ نسواں بل میں قرآن وسنت سے انحراف	دسمبر ۲۰۰۶	۲۷-۴۴
ابوعبدالمعز	قانون تحفظ حقوق خواتین: ایک تحقیقی جائزہ	جنوری ۲۰۰۷	۳۷-۵۳
اسرار احمد، ڈاکٹر	قانون تحفظ حقوق نسواں کا پس منظر وپیش منظر [خطبہ جمعہ]	جنوری ۲۰۰۷	۵-۲۵
خالد محمود خضر	'قانون تحفظ حقوق نسواں' کا سانحہ ☆	جنوری ۲۰۰۷	۳-۴
نوید احمد	تحفظ حقوق نسواں بل: پس پردہ مقاصد اور ہمارا لائحہ عمل	جنوری ۲۰۰۷	۲۶-۳۶
عتیق الرحمٰن صدیقی	حدود اللہ-قرآن کریم کے تناظر میں [حدود آرڈیننس کے تناظر میں]	فروری ۲۰۰۷	۴۹-۵۴
نوید احمد	خواتین کی اصل عظمت اور حقوق-قرآن کی روشنی میں بسلسلہ حدود آرڈیننس	اپریل ۲۰۰۷	۴۱-۶۶
نوید احمد	خواتین کی اصل عظمت اور حقوق: احادیث مبارکہ کی روشنی میں-۱	جولائی ۲۰۰۷	۴۳-۶۰
نوید احمد	خواتین کی اصل عظمت اور حقوق: احادیث مبارکہ کی روشنی میں-۲	اگست ۲۰۰۷	۳۹-۵۸

اسلام کا سیاسی نظام

عبدالرحمٰن الکاف	معاصر اسلامی ریاستوں میں غیر مسلموں کے قانونی اور مدنی حقوق	مارچ ۲۰۰۶	۴۶-۴۸
عبداللہ بن عمر، شیخ	خلیفہ کا تقرر، بنیادی ترین فریضہ [مترجم: طاہر اسلام عسکری]-۱	اپریل ۲۰۰۷	۷۷-۹۰
عبداللہ بن عمر، شیخ	خلیفہ کا تقرر، بنیادی ترین فریضہ [مترجم: طاہر اسلام عسکری]-۲	مئی ۲۰۰۷	۷۳-۹۲
عبدالمنعم مصطفیٰ	حکمرانوں کے خلاف خروج کا مسئلہ [مترجم: جواد حیدر]-۱	اگست ۲۰۰۷	۷۲-۹۲
عبدالمنعم مصطفیٰ	حکمرانوں کے خلاف خروج کا مسئلہ-۲ [مترجم: جواد حیدر]-۲	ستمبر ۲۰۰۷	۸۱-۹۲

اسلام کا معاشرتی نظام

شاہد حفیظ چوہدری	شاید کہ تم پلٹ آؤ! [حالیہ آفاتِ سماوی کے پس منظر میں]	جنوری ۲۰۰۶	۶۵-۷۹
محمد یونس جنجوعہ	حقوق الوالدین	فروری ۲۰۰۶	۳۳-۳۸

محمد یونس جنجوعہ	نرمی اور ملاطفت	اپریل ۲۰۰۶	۶۴-۷۰
محمد یونس جنجوعہ	وقت کی قدر	جون ۲۰۰۶	۵۵-۵۹
محمد یونس جنجوعہ	نئی نسل کی بے راہ روی کا ذمہ دار کون؟ [ذرائع ابلاغ]	جولائی ۲۰۰۶	۳۶-۴۴
محمد یونس جنجوعہ	تبلیس ابلیس [ابلیس کی چالیں]	ستمبر ۲۰۰۶	۳۰-۳۶
رضیہ مدنی، محترمہ	لباس اور حجاب	نومبر ۲۰۰۶	۴۳-۵۰
محمد ایوب، حافظ	عفو درگزر کی اہمیت: سیرت طیبہ کے آئینے میں	فروری ۲۰۰۷	۳۱-۴۸
محبوب احمد خان	کچھ لوگ ایسے بھی ہے کہ [منافقین کی علامات]	مارچ ۲۰۰۷	۶۷-۷۶
ذیشان دانش خان	فرائض اولاد-قرآن حدیث کی روشنی میں	جولائی ۲۰۰۷	۷۷-۸۶
اُم عمار عبدالخالق	ہم کیسے مسلمان ہیں؟ [معاشرتی مسائل]	ستمبر ۲۰۰۷	۷۴-۸۰
ذیشان دانش خان	اسلام اور فیملی پلاننگ	ستمبر ۲۰۰۷	۶۹-۷۳
محمد یونس جنجوعہ	حقوقِ ہمسایہ	نومبر ۲۰۰۷	۷۷-۸۲

تہذیب وثقافت

گوہر مشتاق	ویلنٹائن ڈے- بت پرست رومیوں کا تہوار	فروری ۲۰۰۷	۷۳-۷۸
اُم عمار	فحاشی کا گٹر مشرف با اسلام!	مارچ ۲۰۰۷	۸۳-۸۷
عتیق الرحمٰن صدیقی	اسلام کا تصورِ تفریح اور 'جشن بہاراں' کا تصور	اپریل ۲۰۰۶	۴۹-۵۴
محمد حسین ہیکل	اسلامی تمدن-قرآنی نقطہ نظر سے [ماخوذ از کتاب حیات محمدا]	ستمبر ۲۰۰۶	۷۷-۹۰

اسلام اور مغرب

اسرار احمد، ڈاکٹر	آخری صلیبی جنگ [حالیہ تہذیبی کشمکش تاریخی تناظر میں]	مئی ۲۰۰۶	۵-۲۲
سرفراز اعوان	تہذیبوں کا 'تصادم' اور اُمت مسلمہ کا لائحہ عمل	جون ۲۰۰۶	۷۱-۸۲
اسرار احمد، ڈاکٹر	دین اور مذہب کا فرق اور سیکولرازم کی اصل حقیقت	اگست ۲۰۰۶	۵-۴۰
عاکف سعید، حافظ	استحصالی اور طاغوتی نظام [پریس ریلیز]	نومبر ۲۰۰۶	۶

دعوت وتبلیغ اور تزکیۂ نفس

عتیق الرحمٰن صدیقی	اخلاص: داعیان حق کے لیے کامیابی کی اساس	مارچ ۲۰۰۷	۵۹-۶۶

محمد زبیر	جامعہ حفصہ اور معروف ومنکر [قرآن وحدیث کی روشنی میں]	جون ۲۰۰۷	۶۹-۹۰
عتیق الرحمٰن صدیقی	دعوت وتذکیر کا عمل	جولائی ۲۰۰۶	۳۱-۳۵
رشید عمر	تقرب الٰہی کا پسندیدہ ذریعہ	جولائی ۲۰۰۷	۸۷-۹۲۱
محمد یونس جنجوعہ	چھوٹی چھوٹی نیکیوں پر اجر عظیم	جولائی ۲۰۰۷	۶۱-۷۶
محمد یونس جنجوعہ	عفو ودرگزر کی اہمیت-احادیث نبویہ کی روشنی میں	اگست ۲۰۰۷	۵۹-۶۴
اسرار احمد، ڈاکٹر	قربِ الٰہی کے دو مراتب اور ہماری دینی ذمہ داریاں-۱	اکتوبر ۲۰۰۶	۵-۳۸
اسرار احمد، ڈاکٹر	قربِ الٰہی کے دو مراتب اور ہماری دینی ذمہ داریاں-۲	نومبر ۲۰۰۶	۷-۳۸
عتیق الرحمٰن صدیقی	رحمان کے بندوں کی اہم خصوصیت-تواضع وانکسار	نومبر ۲۰۰۶	۳۹-۴۲
عتیق الرحمٰن صدیقی	کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی!	دسمبر ۲۰۰۶	۳۹-۶۶

تاریخ

محمد زبیر، حافظ	مسجد اقصیٰ کی تولیت کا حقدار کون؟ [ماہنامہ الشریعہ کے مدیر مولانا عمار خان ناصر کے مضمون کا جائزہ]	مارچ ۲۰۰۷	۲۹-۵۸
نوید احمد	مسجد اقصیٰ کی تاریخی اہمیت	جون ۲۰۰۷	۴۳-۶۰
نذیر یٰسین	ایک تیسرے فریق کے خلاف مسلمانوں اور اہل روم کی مشترکہ جنگ [عالمی حالات اور احادیث کی روشنی میں]	اکتوبر ۲۰۰۷	۷۱-۸۶

سیرت وسوانح

محبوب احمد خان	مبلغ اعظم ا [مدارج، طریق کار]	مارچ ۲۰۰۶	۳۱-۴۵
عتیق الرحمٰن صدیقی	سیرتِ نبوی ا کے پانچ اہم درخشندہ پہلو	جون ۲۰۰۶	۲۸-۳۴
محمد ایوب، حافظ	عفو ودرگزر کی اہمیت: سیرت طیبہ کے آئینے میں	فروری ۲۰۰۷	۳۱-۴۸
محمد یونس جنجوعہ	خطبہ حجۃ الوداع-حقوقِ انسانی کا جامع منشور	مارچ ۲۰۰۷	۸۸-۹۰
اسرار احمد	حیات طیبہ کا مکی دور [سلسلہ تقاریر-۳]	اپریل ۲۰۰۷	۵-۳۲
رشید ارشد	نبی کریم ا کی تواضع اور انکساری	اپریل ۲۰۰۷	۶۷-۷۶
عتیق الرحمٰن صدیقی	کہاں سے لائیے تشبیہ رحمت عالم ا	اپریل ۲۰۰۷	۳۳-۴۰
عتیق الرحمٰن صدیقی	نبی کریم ا اور توکل علی اللہ	مئی ۲۰۰۷	۶۵-۷۲

اسرار احمد، ڈاکٹر — حیات طیبہ کا مدنی دور [سلسلہ تقاریر-۴] — جون ۲۰۰۷ — ۵-۴۲

اسرار احمد، ڈاکٹر — دعوت محمدی ا کا بین الاقوامی مرحلہ اور خلافت صدیقی میں انقلاب نبوی ا کا استحکام [سلسلہ تقاریر-۵] — جولائی ۲۰۰۷ — ۵-۲۳

عتیق الرحمٰن صدیقی — نبی اکرم ا کا اسلوبِ خطابت — جولائی ۲۰۰۷ — ۳۳-۴۲

اسرار احمد، ڈاکٹر — خلافت فاروقی ص وعثمانی ص اور انقلابِ نبوی ا کی توسیع [سلسلہ تقاریر-۵] — اگست ۲۰۰۷ — ۵-۳۱

عتیق الرحمٰن صدیقی — طہارت ونظافت نبوی ا — اگست ۲۰۰۷ — ۳۲-۳۸

اسرار احمد، ڈاکٹر — انقلاب نبوی ا کے خلاف تخریبی ردعمل یعنی الفتنہ الکُبریٰ — ستمبر ۲۰۰۷ — ۷-۲۴

عتیق الرحمٰن صدیقی — نبی کریم ا اور محروم طبقات — نومبر ۲۰۰۷ — ۲۴-۳۴

شخصیات

عبدالرشید عراقی — فتنۂ خلق قرآن اور امام احمد بن حنبلؒ — جنوری ۲۰۰۶ — ۳۹-۴۶

عبدالرشید عراقی — مولانا ابوالکلام آزاد — مارچ ۲۰۰۶ — ۸۵-۸۸

اسرار احمد — علامہ اقبال، قائداعظم اور نظریہ پاکستان ☆ — اپریل ۲۰۰۷ — ۳-۴

اسرار احمد، ڈاکٹر — علامہ اقبال، قائداعظم اور نظریہ پاکستان اور اس نظریے سے انحراف کے نتائج [خطاب] — مئی ۲۰۰۷ — ۷-۶۴

عبدالرشید عراقی — امام محمد بن ادریس شافعیؒ — جولائی ۲۰۰۶ — ۷۵-۸۶

راحت نسیم سوہدروی — علامہ اقبال مسجد قرطبہ میں — نومبر ۲۰۰۷ — ۷۰-۷۶

عبدالرشید عراقی — امام اوزاعیؒ — نومبر ۲۰۰۷ — ۸۳-۹۰

عبدالرشید عراقی — امام ہشیم بن بشیر الواسطیؒ — دسمبر ۲۰۰۶ — ۸۸-۸۹

عبدالرشید عراقی — امام یزید بن ہارونؒ — دسمبر ۲۰۰۶ — ۸۵-۸۷

تصویر وطن

عاکف سعید، حافظ — فرقہ وارانہ ہم آہنگی: وقت کی ضرورت ☆ — فروری ۲۰۰۷ — ۳

عاکف سعید، حافظ — ایک بڑے 'یوٹرن' کی ضرورت ☆ — مارچ ۲۰۰۷ — ۳-۴

نوید احمد — پاکستان کا مستقبل: داخلی وخارجی مسائل — مئی ۲۰۰۶ — ۴۵-۷۳

عاکف سعید، حافظ	اپنا قبلہ درست کیجیے! [ہماری حکومت اور معاشی مسائل] ☆	جون ۲۰۰۶	۳
اسرار احمد، ڈاکٹر	حالات کی سنگینی اور اُمید کی کرن ☆	جون ۲۰۰۷	۳
عمران حیدر، مرزا	خودکش دھماکوں کا اہم سبب—محرومیاں	جون ۲۰۰۷	۶۱-۶۸
عاکف سعید، حافظ	حذر اے چیرہ دستاں.....! [ہمارے حکمران اور امریکہ] ☆	جولائی ۲۰۰۶	۳-۴
عاکف سعید	کیسا جشن آزادی؟ ☆	ستمبر ۲۰۰۷	۳-۶
عاکف سعید، حافظ	پس چہ باید کرد؟ ☆	اکتوبر ۲۰۰۷	۳-۶
عاکف سعید، حافظ	باجوڑ کا عظیم سانحہ [دینی مدرسہ پر حکومتی بمباری] ☆	نومبر ۲۰۰۶	۳-۴
اسرار احمد، ڈاکٹر	استحکامِ پاکستان کی واحد اساس اور.....مغربی یلغار کا اصل ہدف	نومبر ۲۰۰۷	۵-۱۶
عاکف سعید، حافظ	سوات کا مسئلہ ☆	نومبر ۲۰۰۷	۳-۴

سانحہ جامعہ حفصہ و لال مسجد

اسرار احمد، ڈاکٹر	جامعہ حفصہ کی انتظامیہ اور حکومت کی خدمت میں ☆	مئی ۲۰۰۷	۳-۶
محمد زبیر	جامعہ حفصہ اور معروف و منکر [قرآن و حدیث کی روشنی میں]	جون ۲۰۰۷	۶۹-۹۰
عاکف سعید، حافظ	'تو موج دُود سے صدا آفتاب ابھریں گے!' [سانحہ جامعہ حفصہ] ☆	اگست ۲۰۰۷	۳-۴
نوید احمد	سانحہ لال مسجد و جامعہ حفصہ رضی اللہ عنہا	ستمبر ۲۰۰۷	۲۵-۵۴

عالم اسلام و عالم مغرب

عاکف سعید، حافظ	سقوطِ ڈھاکہ اور ہمارا طرزِ عمل ☆	جنوری ۲۰۰۶	۳-۴
عاکف سعید، حافظ	باجوڑ پر امریکی حملہ ☆	فروری ۲۰۰۶	۳-۴
قاسم محمود، سید	پاکستان [قسط ۶ تا ۹]		
	جنوری ۲۰۰۶، ص ۸۰-۸۸/ فروری ۲۰۰۶، ص ۸۷-۹۵/ مارچ ۲۰۰۶، ص ۸۹-۹۶		
	اپریل ۲۰۰۶، ص ۸۵-۹۵		
قاسم محمود، سید	تاجکستان	مئی ۲۰۰۶	۹۳-۹۶
قاسم محمود، سید	ترکمانستان	جون ۲۰۰۶	۹۱-۹۶
عاکف سعید، حافظ	اسرائیلی بربریت اور اُمت مسلمہ کی بے حسی ☆	اگست ۲۰۰۶	۳-۴

قاسم محمود، سید ترکی [۱۰/اقساط]
جولائی ۲۰۰۶ء ص ۸۷-۹۶/ اگست ۲۰۰۶ء ص ۹۱-۹۶/ ستمبر ۲۰۰۶ء ص ۹۱-۹۶/ اکتوبر ۲۰۰۶ء ص ۸۹-۹۶
نومبر ۲۰۰۶ء ص ۸۹-۹۶/ دسمبر ۲۰۰۶ء ص ۹۰/ جنوری ۲۰۰۷ء ص ۸۹-۹۵/ فروری ۲۰۰۷ء ص ۸۹-۹۵/
مارچ ۲۰۰۷ء ص ۹۱-۹۶/ اپریل ۲۰۰۷ء ص ۹۱-۹۶

قاسم محمود، سید	تنزانیہ	مئی ۲۰۰۷	۹۳-۹۶
قاسم محمود، سید	تیونس	جون ۲۰۰۷	۹۱-۹۵
قاسم محمود، سید	ٹوگو (Togo)	جولائی ۲۰۰۷	۹۳-۹۶
قاسم محمود، سید	جبوتی (Djibouti)	اگست ۲۰۰۷	۹۳-۹۶
قاسم محمود، سید	چاڈ (Cahd)	ستمبر ۲۰۰۷	۹۳-۹۶
ابوالکلام آزاد	عراق ولیلائے عراق	اکتوبر ۲۰۰۷	۸۷-۹۳
قاسم محمود، سید	سُرینام (Suriname)	اکتوبر ۲۰۰۷	۹۴-۹۶
قاسم محمود، سید	سعودی عرب	نومبر ۲۰۰۷	۹۱

تقابلِ ادیان

طاہر اسلام عسکری کیا تمام مذاہب برحق ہیں؟ [نظریۂ وحدتِ ادیان کے حامیوں کے نظریات جائزہ] دسمبر ۲۰۰۶ ۴۵

تنظیم اسلامی

عاکف سعید، حافظ	خصوصی اجتماع برائے ذمہ دارانِ تنظیم ☆	اپریل ۲۰۰۶	۳-۴
نوید احمد	نفاق کی حقیقت اور جماعتی زندگی میں اظہار اختلاف کے آداب	جون ۲۰۰۶	۳۵-۴۸
اسرار احمد، ڈاکٹر	پیغام [بسلسلہ اجتماع]	نومبر ۲۰۰۶	۰

تنقید و تحقیق

گوہر رحمٰن، مولانا	اشراقی تجدد کا جائزہ - الجماعۃ، خروج وغیرہ [فکر غامدی]	جنوری ۲۰۰۶	۴۷-۶۴
محمد موسیٰ بھٹو	جاوید احمد غامدی کے فکر کا تجزیاتی مطالعہ	اگست ۲۰۰۶	۷۷-۹۰
طاہر اسلام عسکری	اسلام میں تجدد پسندی - فکر غامدی [بسلسلہ حدود و تعزیرات-۱]	اکتوبر ۲۰۰۶	۸۱-۸۸

طاہراسلام عسکری	اسلام میں تجدد پسندی-فکرغامدی[بسلسلہ حدود وتعزیرات-۲]	نومبر۲۰۰۶	۷۴-۶۸
طاہراسلام عسکری	اسلام میں تجدد پسندی-فکرغامدی[بسلسلہ.................-۳]	جنوری۲۰۰۷	۷۸-۶۷

لمحہ فکریہ

ادارہ	اے بادِصبا ایں ہمہ آوردۂ تست [لمحہ فکریہ]	فروری۲۰۰۷	۴
عاکف سعید، حافظ	ہم اور ہمارا دین-چند لمحاتِ فکریہ☆	مئی۲۰۰۶	۴-۳
محمد ابوبکر احمد	طائرانِ فلک اور اشرف المخلوقات-لمحہ فکریہ	جولائی۲۰۰۶	۵۹-۴۹

متفرقات

محمد شاہد حنیف	اشاریہ ماہنامہ 'میثاق' [۲۰۰۴ء-۲۰۰۵ء]	جنوری۲۰۰۶	۹۸-۸۹
عتیق الرحمٰن صدیقی	اسلام اور جاہلیت [تفسیر تفہیم القرآن کے پس منظر میں]	فروری۲۰۰۶	۳۲-۲۵
عتیق الرحمٰن صدیقی	دینی تعلیمی کے مراکز اور حکومتی طرزِ عمل	مارچ۲۰۰۶	۵۲-۴۹
گوہر مشتاق، ڈاکٹر	موسیقی......ایک مذہبی اور سائنسی تجزیہ	جون۲۰۰۶	۵۴-۴۹
نوید احمد	نفاق کی حقیقت اور جماعتی زندگی میں اظہار اختلاف کے آداب	جون۲۰۰۶	۴۸-۳۵
بنتِ زاہد	تحویل قبلہ [تاریخ وحقیقتِ قبلہ]	ستمبر۲۰۰۶	۵۵-۴۹
الطاف الرحمٰن بنوی	استخلاف فی الارض اور اسکے عملی تقاضے [تخلیق وخلافتِ آدمؑ]	اکتوبر۲۰۰۶	۶۴-۵۲
محمد یونس جنجوعہ	صوفی اور مجاہد	اکتوبر۲۰۰۷	۵۸-۵۱

ظ......ظ......ظ......ظ

نوٹ: دسمبر۲۰۰۷ کا شمارہ شائع کرنا ہے۔